Monthly **AWAMI JAMHURIAT**

عوامی جمہوریت

ماہنامہ جون/جولائی 2018

☆

اشاعت کا
50واں سال

انتخابات 2018ء

http://jul18.aj-pak.org

شمارہ نمبر۔ 4

جلد نمبر۔ 14

MONTHLAY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE

ماہنامہ
عوامی جمہوریت
لاہور

CPL No 279

جون/ جولائی 2018

قیمت: 30 روپے

ادار یہ

عام انتخابات
سیاسی پارٹیوں اوراسٹیبلشمنٹ کا کردار

پاکستان کی سترسالہ تاریخ سیاسی پارٹیوں اور سول ملٹری اسٹیبلشمنٹ کے درمیان کشمکش کی تاریخ رہی ہے۔ابتدائی سالوں میں ہی سیاسی قیادت نے اس جدید نو آبادیاتی ریاست کوامریکی ومغربی سامراجی ممالک کے ساتھ نتھی کردیا۔حتیٰ کہ سوشلسٹ ممالک کے خلاف سامراجی دفاعی معاہدوں میں شریک ہوگئے لہذا سول وملٹری اسٹیبلشمنٹ کا مکمل سیاست اور سیاسی پارٹیوں پر بالادستی قائم کرنا لازمی امر تھا خاص کر جب نئے آزاد ملک میں سیاسی پارٹیاں تنظیمی طور پر کمزور اور اپنے طبقاتی کردار کے لحاظ سے نیم جاگیردارانہ اورنیم قبائلی سماج کوقائم رکھتے ہوئے سامراجی بالادستی میں سرمایہ دارانہ تعمیر کی نمائندہ ہوں لہذا انہوں نے سامراج دشمن اور محنت کش طبقے کی اس وقت واحد نمائندہ پارٹی یعنی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان پر 1954ء میں ہی پابندی لگا دی۔ آئین سازی میں قراردادِ مقاصد پاس کرکے اور مغربی پاکستان میں ون یونٹ قائم کرکے اس کی بنیادیں سیکولرزم کے بجائے مذہب اور وفاقیت کے بجائے مرکزیت پررکھی گئیں جو جمہوریت اور وفاقیت دونوں کی نفی تھیں۔چیف آف آرمی اسٹاف جنرل ایوب خان کووزیردفاع بنادیا گیا اوراس طرح فوج کا سیاست میں براہ راست عمل دخل شروع ہوگیا اور بالآخر انہوں نے 1956ء کے آئین کوتوڑکر 1958ء میں مارشل لانافذ کردیا اوراس طرح مکمل طور پر فوج نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی' اس کے بعد فوجی جنتا نے بدترین مرکزیت پر مبنی 1962ء کا آئین نافذ کیا جس کوملک کی جمہوری قوتوں نے ماننے سے انکار کردیا اور ایک طویل وبھرپور جدوجہد کے نتیجے میں دس سال بعد 1968ء میں دورایوبی کا خاتمہ جنرل یحیٰ خان کی قیادت میں ایک مارشل لا کی صورت میں ہوا۔ یہ اس طویل سیاسی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ یحیٰ خان نے مغربی پاکستان میں ون یونٹ توڑکر صوبے بحال کردیے اور ون مین' ون ووٹ کے جمہوری اصول کوتسلیم کرتے ہوئے 1970ء میں ملکی تاریخ کے پہلے عام انتخابات کرائے مگران انتخابات کے نتائج کوتسلیم کرنے سے انکار کردیا اور جارحانہ فوجی آپریشن کے ذریعے مشرقی پاکستان کے عوام کوکچلنے کی کوشش کی' جس کے نتیجے میں پاکستان ٹوٹ گیا اور بنگلہ دیش کی آزاد ریاست کا قیام عمل میں آیا۔

نئے پاکستان میں پیپلزپارٹی کے چیئرمین ذوالفقارعلی بھٹو پہلے سویلین مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر بنے اور

ایڈیٹر
اختر حسین

مجلس ادارت
عابد حسن منٹو
مسلم شمیم' صباالدین صبا' توقیر چغتائی
اثر امام' عابد شکیل فاروقی

مینجنگ ایڈیٹر
اے آر عارف

سرکولیشن منیجر
اشتیاق اعظمی

لاہور آفس 5 میکلوڈ روڈ لاہور پاکستان

اداریہ		1
پاکستان میں وفاقیت......	ڈاکٹر سید جعفر احمد	3
پاکستان' حکمرانی کا بحران......	زاہدا سلام	9
مارکسی نظریہ داں۔ڈاکٹر حسان......	مسلم شمیم	17
مشرق وسطیٰ کا بحران	ریاض شیخ	22
رسالہ عوامی جمہوریت......	شاہ محمد مری	24
انتخابات 2018 کا منشور	ادارہ	27
پروفیسر یوسف حسن	امجد اسلام امجد	29
امیدواران انتخابات 2018	ادارہ	30
ایک نظر......	عابد شکیل فاروقی	31

فون: 042-37353309-37357091
فیکس: 94-42-36361531
کراچی آفس: 201-204 یورما سینٹر نمبر 1 فاطمہ جناح روڈ صدر کراچی
Email:awami.jamhuriat@gmail.com

اور 1973ء کا آئین منظور ہونے کے بعد پہلے منتخب وزیراعظم' لیکن انہوں نے بھی فوجی اور سامراجی دباؤ کے تحت بلوچستان میں نیپ۔ جے یو آئی کی منتخب اکثریتی اسمبلی کو برخاست کر کے فوجی آپریشن شروع کر دیا ''احتجاجاً NWFP (موجودہ کے پی کے) کی حکومت نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ ملک کی واحد سیکولر اور جمہوری پارٹی یعنی نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) پر پابندی لگا دی گئی اور اس کی پوری قیادت کو گرفتار کر کے ملک کے خلاف نام نہاد سازش کا مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں بھٹو حکومت کے خلاف سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوا اور بالآخر 1977ء میں جنرل ضیاالحق کی قیادت میں ایک اور مارشل لا نافذ ہو گیا۔ اس کے چند ماہ بعد ہی یعنی اپریل 1978ء میں افغانستان میں سوشلسٹ انقلاب آ گیا جس نے اس پورے خطے کی صورت حال بدل دی۔ امریکی سامراجی ممالک اور ان کے حواریوں' عرب بادشاہوں اور شیوخ نے اپنے نظام کو خطرہ محسوس کرتے ہوئے پوری دنیا سے مسلمان مذہبی انتہا پسندوں کو جمع کر کے ڈالرز اور اسلحے کی طاقت اور مذہب اسلام کے نام پر مسلح جہاد شروع کر دیا جس نے پاکستانی سیاست اور سماج میں مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کا نیا عنصر داخل کر دیا جس کی تمام باگ ڈور بھی فوجی اسٹیبلشمنٹ کے پاس تھی اور ابھی بھی قائم ہے۔ ضیاالحق کی بدترین فوجی آمریت کا خاتمہ دس سال بعد 1988ء میں ایک ہوائی حادثے کی صورت میں ہوا اور ملک کی باگ ڈور جنرل مرزا اسلم بیگ کے ہاتھ میں آ گئی جنہوں نے فوری انتخابات تو کرائے اور حکومت اکثریتی پارٹی یعنی پی پی پی کے حوالے کی گئی مگر دو سال بعد ہی صدارتی حکم سے برخواست کر دیا گیا اور 1990ء میں نئے انتخابات کا اعلان ہوا جس کی تمام مینجمنٹ فوج کے سب سے بڑے سیاسی ادارے آئی ایس آئی کے پاس تھی جس نے اپنی مرضی کے نتائج کے حصول کے لیے سیاست دانوں میں فنڈز تقسیم کیے جو کہ ائیر مارشل اصغر خان کے داخل کیے گئے مقدمہ کی صورت میں عدالتی ریکارڈ پر موجود ہے ان سات سالوں کے عرصے میں کسی بھی سویلین حکومت کو چلنے نہیں دیا اور بالآخر 1997ء میں ایک دفعہ پھر جنرل پرویز مشرف کی قیادت میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا جن کا اقتدار دس سال تک قائم رہا اور اس کا خاتمہ سیاسی وعدلیہ کی تحریک کے نتیجے میں ہوا۔

اس تمام عرصے میں دفاعی اداروں اور ان کے افسران کے ملک کی معیشت میں وسیع تر مفادات قائم ہو گئے۔ ملک کا 35 فیصد سے زیادہ کارپوریٹ سرمایہ دفاعی اداروں کا ہے اس کے علاوہ ملک کی تجارت اور دیگر کاروبار میں ان کا وسیع تر کردار قائم ہو گیا ہے۔ ٹرانسپورٹ سے لے کر ہر کاروبار حتیٰ کہ شادی وسینما ہال تک فوجی اداروں کے ہیں اور وسیع پیمانے پر ملٹری لینڈ کمرشل استعمال ہو رہا ہے اور اس کو سپریم کورٹ بھی کچھ کہنے کو تیار نہیں۔ موروثی زمینداروں کے علاوہ سرکاری زرعی زمینوں کی الاٹمنٹ بھی بڑے پیمانے پر فوجی افسران کو جاری ہے اور اس طرح وہ سب سے بڑے غیر حاضر زمیندار بن گئے ہیں لہٰذا فوجی جنتا موجودہ زمیندارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی محافظ بن گئی ہے۔

ملک کی ستر سالہ تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے حکمران طبقات کی سیاسی و مذہبی پارٹیاں اپنے اقتدار کے لیے تو کشمکش کرتی ہیں مگر اس کشمکش میں بھی ہر پارٹی اپنے اقتدار کے لیے دوسری برسر اقتدار پارٹی کے خلاف عوام کی طاقت پر بھروسہ کرنے کے بجائے فوج ہی کے ساتھ ساز باز کرتی ہے۔ جنرل پرویز مشرف کے اقتدار کے خاتمے کے بعد فوج نے شاید یہ فیصلہ کیا ہے کہ براہ راست اقتدار سنبھالنے کے بجائے پیچھے بیٹھ کر اپنے تمام معاشی و سیاسی مفادات کو قائم رکھا جائے' اس طرح عوام کے ساتھ کھلی محاذ آرائی سے بھی بچا جا سکتا ہے' گزشتہ دس سالوں کی سولین منتخب حکومتوں کے دوران بھی دفاعی' خارجی' مالی اور حتیٰ کہ داخلی پالیسیاں بھی فوجی اسٹیبلشمنٹ کے کنٹرول میں رہیں نواز شریف دور میں انہوں نے صنعتی وتجارتی طبقے کے مفاد کے لیے ہندوستان کے ساتھ جونہی دوستانہ تجارتی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تو ان کے خلاف سازشوں' دھرنوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس کام کے لیے حزب اختلاف کی سیاسی پارٹیاں تیار تھیں۔ 2018ء کے انتخابات کے حوالے سے پہلے تو ایسا ماحول بنایا گیا اور قیاس آرائیاں شروع کی گئیں کہ جیسے انتخابات ہی وقت پر نہیں ہوں گے یعنی ہر وقت بے یقینی کی صورت حال قائم رکھی گئی تاکہ بڑے پیمانے پر کسی مثبت تبدیلی کے لیے عوام کو متحرک نہ کیا جا سکے اور انتخابات میں اپنی مرضی کے نتائج برآمد کیے جا سکیں عوام یہ یقین کرنے پر حق بجانب ہیں کہ اس عرصے میں نیب اور اعلیٰ عدلیہ کے ادارے بھی اس ساز باز میں دانستہ یا نادانستہ معاونت کر رہے ہیں۔ انتخابات کے بعد بھی کئی سیاست دانوں اور منتخب اراکین پر مقدمات قائم کیے جا سکتے ہیں اور حکومت اسٹیبلشمنٹ کی مرضی کی ہی بنے گی۔ فوجی اسٹیبلشمنٹ کا یہ سیاسی کردار اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ فوج کا سیاسی کردار زبان زد عام ہے مگر عوام کو اس کے خلاف اس وقت تک متحرک نہیں کیا جا سکتا جب تک سیاسی پارٹیاں عوام کے بنیادی زندگی کے حقوق کے لیے بنیادی معاشی تبدیلیوں کو اپنے پروگرام کا حصہ نہیں بناتیں لیکن حکمران طبقات کی تمام بڑی سیاسی و مذہبی پارٹیاں بنیادی معاشی تبدیلی کا کوئی پروگرام نہیں رکھتیں' ان پارٹیوں کے ان انتخابات میں اعلان کیے گئے منشور کو بھی دیکھیں تو ان میں کوئی بھی نہ تو موجودہ جاگیرداری وقبائلی باقیات و بڑی زمینداریوں کا خاتمہ چاہتا ہے نہ ہی بین الاقوامی سامراجی نظام اور اس کے اداروں کے خلاف ہے اور نہ ہی آئینی طور پر عوام کو مفت تعلیم' روزگار' صحت اور رہنے کی چھت کو گارنٹی کرنا چاہتا ہے لہٰذا یہ فریضہ صرف بائیں بازو کی سیاسی پارٹیاں ہی اپنی مسلسل جدوجہد سے ادا کر سکتی ہیں 25 جولائی 2018ء کے انتخابات اس سمت میں جدوجہد کا ایک نیا آغاز ہے۔

☆☆☆

پاکستان میں وفاقیت کا تاریخی ارتقاء

ڈاکٹر سید جعفر احمد

ابتدائیہ:

پاکستان دنیا کے ان اٹھائیس (۲۸) ممالک میں شامل ہے جنہوں نے وفاقی طرزِ حکومت اپنایا ہے۔ پاکستان میں وفاقیت گزشتہ سات دہائیوں کے طویل ارتقائی عمل سے گزری ہے۔ اس طویل سفر میں کئی مشکل مراحل اور بحرانوں کے ساتھ ساتھ کچھ کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ ملکی تاریخ کی اس طویل مسافت کو جانچنے سے پاکستان کی سیاسی تاریخ کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس مضمون میں پاکستان میں وفاقیت کے مختلف مراحل کو آئینی تبدیلیوں کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ تاہم اس موضوع پر آنے سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ پاکستان کے لیے وفاقیت ناگزیر کیوں ہے؟ یا وہ کون سے تاریخی، سیاسی اور معاشرتی حقائق ہیں جو وفاقی طرزِ حکومت کو ہمارے لیے اہمیت کا حامل بنا دیتے ہیں؟ یہاں مختصراً یہی جائزہ لیا گیا ہے کہ پاکستان کس طرح وفاقی طرزِ حکومت اپنانے پر مجبور ہوا۔

وفاقیت کا تصور:

تاریخی طور پر وفاقی طرزِ حکومت زیادہ تر ان ممالک میں اپنایا جاتا رہا ہے جن کا رقبہ اور آبادی زیادہ رہی ہے۔ ایسے ممالک میں جن کا رقبہ یا آبادی زیادہ ہوتی ہے، وہاں ملک کے باشندوں میں نسلی، لسانی اور ثقافتی تنوعات کے بھی زیادہ ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ یکساں نوعیت کی آبادی والے ممالک کو اس طرح کے اداروں کی ضرورت نہیں ہوتی جیسی متنوع آبادی والے ممالک کو ہوتی ہے۔ ایک وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی متنوع آبادی کے لیے ایسے سیاسی نظام کی ضرورت ہوتی ہے جو آبادی کے ہر حلقے یا گروہ کی ضروریات کو پورا کر سکے اور اگر یہ نسلی، لسانی وثقافتی گروہ مخصوص علاقوں میں پھیلے ہوں تو اس صورت میں علاقائی اور جغرافیائی اکائیاں وجود میں آتی ہیں جنہیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کے لیے قانونی اور سیاسی انتظامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ وفاقی نظام میں دو سطح کی حکومت ہوتی ہے۔ ایک وہ جو کہ پورے ملک پر حکومت کرتی ہے اور دوسری علاقائی حکومت، جس کی عملداری مخصوص خطے پر ہوتی ہے۔

وفاقیت کے تصور پر کافی علمی اور نظری مواد موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس کے عملی اور انتظامی پہلوؤں پر بھی کیے گئے کام کی کمی نہیں ہے۔ اس سارے مواد کی مدد سے وفاقیت کے اُن اجزائے ترکیبی کو سمجھا جا سکتا ہے جن کے بغیر کوئی ملک وفاقی طرزِ حکومت کا حامل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

یہاں کسی طویل نظری بحث میں پڑے بغیر صرف اس نکتے تک خود کو محدود رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک حقیقی فیڈریشن میں کس طرح دو سطحی حکومت کو دیکھا جانا چاہیے۔ اس کے لیے کچھ ماہرینِ وفاقیت کے حوالے دینا بے جا نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر آئینی امور پر گہری نظر رکھنے والے معروف مصنف اے۔ وی۔ ڈائسی (A.V. Dicey) نے وفاقی ریاست کو اس طرح بیان کیا ہے: ''وفاقی مملکت قومی اتحاد اور علاقائی وحدتوں کے حقوق کی ہم آہنگی کے لیے اختیار کردہ سیاسی تدبیر کا نام ہے''۔ وفاقیت پر اپنے تاریخی کام میں کے سی وھیئر (K.C. Wheare) نے وفاقی نظام کے پیچھے کارفرما ایک اصول کی نشاندہی کی ہے جس کو ''وفاقی اصول'' کہا گیا ہے۔ اس کے مطابق ''وفاقیت یہ ہے کہ مرکزی اور علاقائی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا طریقہ کار اس طرح طے کیا جائے کہ مرکز اور وحدتیں اپنے اپنے دائرہ کار کے اندر آزادانہ طور پر، اور پھر آپس میں مل کر مربوط طریقے سے کام کریں۔'' اس اصول کے تحت وفاق کے عوام کو بیک وقت دو طرح کے قوانین کی پیروی کرنی ہوتی ہے۔ یعنی وہ ایک طرف مرکزی حکومت کے اور دوسری طرف علاقائی حکومت کے قوانین پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں حکومتوں کے دائرہ کار کا بھی واضح تعین ہونا چاہیے تاکہ کوئی ایک حکومت دوسرے کے کام یا حدود میں مداخلت نہ کرے۔ حدود کا یہ تعین آئین کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ حدود کا یہ آئینی طور پر تعین وفاقی نظامِ حکومت کے درست طریقے سے چلنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اسی وجہ سے وفاق کا آئین انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اور اسی لیے وفاقی نظام کے آئین کو مرکزی اور علاقائی حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس وقت دنیا کے جن اٹھائیس (۲۸) ممالک میں وفاقی طرزِ حکومت رائج ہے اُن میں مجموعی طور پر دنیا کی کل آبادی کا چالیس (۴۰) فیصد حصہ آباد ہے۔ ان ممالک کے اپنی مرکزی اور علاقائی حکومتوں کی مضبوطی کے تناظر میں نظام کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے۔ دنیا میں بہت مرکزیت پر مبنی وفاق بھی موجود ہیں جہاں زیادہ اختیارات مرکز کے پاس ہیں اور ایسے ممالک بھی موجود ہیں جہاں عدم مرکزیت ہے اور زیادہ اختیارات علاقائی حکومتوں کے پاس ہیں۔ کچھ وفاقی مملکتوں کے تجربے سے پتا چلتا ہے کہ وفاقی حکومت کے طویل دورانیے اور مرکز

اور وحدتوں کی حکومتوں کے درمیان اعتماد پیدا ہونے کے بعد وفاق پہلے کی نسبت زیادہ مرکزیت کی طرف مائل ہو گئے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس کی ایک مثال ہے۔ وہاں وحدتوں کو اُن کے اطمینان کے مطابق اختیارات مل گئے، اور ان پر ایک طویل عرصے تک عملدرآمد بھی ہوتا رہا تو، پھر اُن میں مرکز کے بارے میں اعتماد بڑھنا شروع ہوا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی دریافتوں نے وحدتوں کو مرکز کے قریب آنے کے مزید مواقع اور اسباب فراہم کر دیے۔ چنانچہ آج امریکی وفاقی مرکز ماضی کے مقابلے میں خاصا طاقتور بن چکا ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ بحث چل نکلی ہے کہ کیا ہم نے مرکز کو کچھ زیادہ ہی اختیارات تو نہیں دے دیے؟ جدید مواصلاتی نظام، زیادہ مربوط پالیسیوں کی کوششوں اور عالمی دباؤ نے بھی بعض فیڈریشنز کو مرکزیت کی جانب مائل کرنے میں کردار ادا کیا ہے لیکن یہ عمل اسی صورت میں بغیر رکاوٹ کے جاری رہ سکتا ہے جبکہ علاقائی یا وحدتوں کی حکومتیں اس سے کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔ تجربے سے پتا چلتا ہے کہ وفاقیت، جمہوری نظامِ حکومت کے اہم ذریعہ کے طور پر سامنے آئی ہے۔ ایسی صورت میں جہاں جمہوریت کی وجہ سے ایک خطہ اپنی عددی برتری سے حاوی ہو جائے وہاں وفاقیت اس کے خلاف قوت کے طور پر سامنے آسکتی ہے۔ انہی بنیادوں پر وقت کے ساتھ ساتھ وفاقیت نے ایسے معاشروں میں قبولیت حاصل کر لی ہے جہاں کئی طرح کے ثقافتی، سماجی اور سیاسی مفادات روبہ کار ہوں۔

پاکستان کے لیے وفاقیت کی اہمیت:

پاکستان کے لیے وفاقی طرزِ حکومت کا انتخاب آزادی سے قبل ہی بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح اور تحریکِ پاکستان چلانے والی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ نے کر لیا تھا۔ اگرچہ قیامِ پاکستان کے وقت اور خاص طور پر قائداعظم کی وفات کے بعد وفاقی طرزِ حکومت کے خلاف بعض حلقوں کی جانب سے آواز اٹھائی گئی اور تجویز کیا گیا کہ نئے ملک کے لیے وحدانی حکومت بہتر ہوگی کیونکہ مضبوط مرکزی حکومت کی ضرورت ہے لیکن سیاسی اکثریت کا ماننا تھا کہ وفاقی طرزِ حکومت سے ہی ملک کو متحد رکھا جا سکتا ہے۔

تاریخی طور پر کم از کم تین اہم عناصر ایسے تھے جن کے باعث نئے ملک کے لیے وفاقیت ناگزیر تھی۔ پہلا یہ کہ غیر منقسم ہندوستان میں صوبائی خودمختاری جناح کی قیادت میں مسلم لیگ کا مسلسل مطالبہ رہی۔ ۱۹۴۷ء کی آزادی سے قبل تین دہائیوں تک جناح نے مسلسل مسلم صوبوں کی تعداد میں اضافے، صوبوں کے لیے زیادہ خودمختاری اور تمام صوبوں کے لیے ایک جیسی خودمختاری کے لیے دلائل دیے۔ اس عرصے کے دوران جناح کبھی طاقتور مرکز کے خلاف بات کرنے سے نہیں ہچکچائے۔ ان کی یہ کوشش کہ مسلم اکثریتی صوبوں کی تعداد میں اضافہ ہو، متحدہ ہندوستان کے وفاق میں مسلمانوں کو بہتر مقام دلانے کی ایک کوشش تھی۔ جب متحدہ ہندوستان میں مسائل کے حل کی ان کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو جناح نے مسلم اکثریتی صوبوں اور ان کے اندر موجود ریاستوں پر مبنی الگ فیڈریشن کا مطالبہ کر دیا۔

دوسرا یہ کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کے لیے جو طریقۂ کار طے کیا گیا اور مسلم اکثریتی صوبوں کے الگ وفاق کا قیام جس طرح عمل میں لایا گیا اس نے بھی نئے ملک کے لیے وفاقیت کی راہ متعین کر دی۔ اس بات کا تعین کرنے کے لیے کہ آیا غیر منقسم ہندوستان کے مسلم اکثریتی صوبے بھارتی فیڈریشن میں رہنا چاہتے ہیں یا اپنی الگ فیڈریشن بنانا چاہتے ہیں، ان صوبوں کو فیصلہ کرنے کا حق دیا گیا۔ یا تو مسلم اکثریتی صوبے کی اسمبلی کے مسلم ارکان کو اپنے صوبے سے متعلق فیصلہ کرنے کا کہا گیا یا براہِ راست ریفرنڈم کے ذریعے فیصلہ کرایا گیا۔ اس سے یہ نقطۂ نظر مضبوطی حاصل کرتا ہے کہ یہ وفاقی اکائیاں تھیں جنہوں نے پاکستان کی فیڈریشن کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اسی بنیاد پر یہ کہنا بھی بلا جواز نہیں ہے کہ پاکستان کا وفاق، صوبوں کا تشکیل کردہ ہے۔ اسے اوپر سے، مرکز نے قائم نہیں کیا بلکہ وحدتوں نے اپنی مرضی اور منشا سے اس کی تشکیل کی ہے۔

اگرچہ پہلے دونوں عناصر ماضی اور ملک کے قیام کے تاریخی تناظر سے متعلق تھے، لیکن تیسرے عنصر کا تعلق پاکستانی معاشرے کی ساخت سے ہے۔ پاکستان میں رہنے والے مختلف ثقافتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لسانی شناخت رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور مختلف سماجی روایات کی پیروی کرتے ہیں تاہم صدیوں کے باہمی روابط کے باعث ان کے درمیان بہت سی یکسانیت بھی ہے۔ اس طرح کے متفرق اور متنوع معاشرے کو وفاقیت کے اصول پر ہی ایک ریاست میں پرویا جا سکتا ہے۔

پاکستان کی ابتدائی آئینی خرابیاں:

عوام کی توقعات کے برعکس، جو تحریک پاکستان کے جذبے سے مالا مال تھے، جن مقاصد کے پیشِ نظر پاکستان قائم کیا گیا تھا وہ آزادی کے بعد پورے نہیں ہو سکے۔ آزادی کے تیرہ ماہ کے اندر قائداعظم کے انتقال سے منظر سے سب سے مؤثر شخصیت ہٹ گئی۔ چونکہ انہوں نے ملک کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا لہٰذا خیال یہی ہے کہ اگر وہ کچھ اور عرصہ زندہ رہتے تو ملک کو آئین سازی کی راہ پر بھی ڈال سکتے تھے۔ چونکہ ان کی قیادت میں ملک کا قیام ممکن ہوا تھا، اور انہوں نے مختلف صوبوں کی قیادتوں کو کسی نہ کسی طور جوڑ رکھا تھا، لہٰذا خاصا امکان تھا کہ بعد ازاں صوبوں کے درمیان جو اختلافی مسائل پیدا ہوئے، قائداعظم زندہ رہتے تو شاید ان اختلافات کی اس خلیج کو پاٹنا اتنا دشوار نہ ہوتا۔ بانیٔ پاکستان کی وفات سے ایسا خلا پیدا ہو گیا جسے باقی قائدین پُر کرنے میں ناکام رہے کیونکہ وہ ان کا پرتو تک نہیں تھے۔

اس خلا کو زیادہ طاقتور ادارے سول سروس نے پورا کیا جسے فوجی اسٹیبلشمنٹ کی شکل میں ایک عمدہ اتحادی مل گیا۔ اس سول ملٹری اتحاد نے ریاست میں طاقتور ڈھانچہ تشکیل دیا اور ملک کو، یا تو سول حکومت کے پیچھے رہ کر یا براہ راست فوجی حکومت کے ذریعے چلایا۔ ملکی تاریخ کی سات دہائیوں میں تقریباً، نصف عرصہ فوجی حکمران ملک پر مسلط رہے۔

پہلی دہائی میں پاکستان ایک ایسے آئین کی تلاش میں سرگرداں رہا جو اس کے مختلف خطوں کو ساتھ مل کر چلنے کے لیے درکار اعتماد فراہم کرسکتا۔ پہلا آئین تشکیل دینے میں نو سال لگ گئے۔ یہ آئین وفاقیت کی روح سے عاری، اور ترغیب وتحریص کے ذریعے کروائے گئے سمجھوتوں کا حاصل تھا۔ ۱۹۵۶ء میں اپنایا گیا یہ آئین محض اڑھائی سال ہی نکال سکا اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں آئین توڑ دیا گیا اور مارشل لا نافذ کردیا گیا۔

فوجی حکمران ایوب خان نے ۱۹۶۲ء میں نیا آئین دیا جو کسی آئین ساز اسمبلی یا کسی آئینی اجتماع (Convention) نے نہیں بلکہ ایوب خان کی کابینہ کے چند وزراء پر مشتمل ایک کمیٹی نے تیار کیا۔ لیکن اسے سات سال بعد ہی ایک اور فوجی حکمران یحییٰ خان کو اقتدار کی منتقلی کے وقت خود ایوب خان نے توڑنے کا اعلان کیا۔ یحییٰ خان کی حکومت ملک ٹوٹنے اور مشرقی پاکستان الگ ہونے پر ختم ہوئی۔

تیسرا آئین ۱۹۷۳ء میں تشکیل دیا گیا، جسے ۱۹۷۷ء میں اور ۱۹۹۹ء میں بالترتیب جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کے فوجی قبضے کے نتیجے میں معطل کیا گیا۔ فوجی حکومتوں کے درمیانی زمانوں میں سول حکومتوں نے آئین کی بحالی اور اپنے آپ کو دوبارہ منظم کرنے کی کوشش کی۔ بعض اوقات ان کی کوششیں ضائع ہوئیں اور کبھی انہیں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

ملک کے پورے آئینی سفر کے دوران وفاقیت اہم عنصر رہا۔ پہلی دہائی کے دوران مشرقی اور مغربی حصے کے درمیان اختلافات رہے۔ مشرقی بنگال ملک کے مغربی حصے سے زیادہ آبادی کا حامل تھا۔ اس لیے اس نے آبادی کی بنیاد پر نمائندگی کا مطالبہ کیا لیکن یہ اصول حکمران طبقے کے لیے ناقابل قبول تھا۔ اگرچہ دیگر آئینی مسائل بھی تھے جیسا کہ طرزِ حکومت، ریاست اور مذہب کا تعلق وغیرہ لیکن اصل اختلاف مرکز اور صوبوں کے تعلقات اور دونوں بازوؤں کے درمیان نمائندگی کا تھا جو کہ حل کرنا سب سے مشکل ثابت ہوا۔ تاہم ۱۹۵۴ء میں محمد علی بوگرہ فارمولا ملک کے دونوں حصوں کے اہم سیاسی حلقوں کو قریب لانے کا باعث بنا لیکن یہ ملک کی سول ملٹری اسٹیبلشمنٹ کے لیے ناقابل قبول تھا۔ ان اداروں نے ریاستی ڈھانچے پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تھی۔ اس کے نتیجے میں آئین ساز اسمبلی کو تحلیل کردیا گیا اور ایک وفاقی عدالت نے گورنر جنرل کے فیصلے کی توثیق کردی۔ دوسری آئین ساز اسمبلی ۱۹۵۵ء میں وجود میں آئی۔ اس سے قبل ملک کے مغربی حصے میں شامل صوبوں اور ریاستوں کو باہم مدغم کرکے وحدت مغربی پاکستان قائم کی گئی۔ ساتھ ہی کہا گیا کہ اب چونکہ ملک کے مشرق اور مغرب میں دو ہی صوبے ہیں، لہٰذا ان میں نمائندگی کا تناسب برابر برابر ہوگا۔ برابری (Parity) کے اس مصنوعی اصول کی بنیاد پر دوسری آئین ساز اسمبلی نے ۱۹۵۶ء کا آئین تشکیل دیا۔ اس کی بنیاد ایک غیر حقیقی اور مشکل سمجھوتے پر رکھی گئی جس میں مغربی حصے کے تین صوبوں اور تمام دس ریاستوں کو ملا کر ایک صوبہ مغربی پاکستان کے نام سے قائم کیا گیا۔ یہ محض اس بنا پر کیا گیا کہ ملک میں صرف دو صوبے مشرقی اور مغربی پاکستان ہوں گے تو آبادی کی بنیاد پر نمائندگی کے مشرقی پاکستان کے مطالبے کو رد کردیا جائے گا۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور کہا گیا کہ اب آبادی کی بنیاد پر نمائندگی کی کوئی ضرورت نہیں۔ یوں مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان برابری نافذ کردی گئی۔ یہ اسکیم مغربی حصے کے چھوٹے صوبوں کے سیاسی رہنماؤں کی اکثریت کی جانب سے مسترد کردیے جانے کے باوجود نافذ کی گئی، یہاں تک کہ دونوں حصّوں کے وہ سیاستدان جنہوں نے پہلے اس کو منظور کیا تھا وہ بھی بعد میں اس کے مخالف ہوگئے۔

۱۹۵۸ء میں فوج کے اقتدار سنبھالنے کی ایک وجہ ون یونٹ کے تسلسل کو یقینی بنانا بھی تھا۔ ایوب کے ۱۹۶۲ء کے آئین میں بھی اس کو شامل کیا گیا۔ جنرل یحییٰ خان کی فوجی حکومت کے دوران شدید عوامی مخالفت کے باعث ون یونٹ کو ختم کرکے سابقہ صوبے بحال کیے گئے۔ مزید یہ کہ برابری کے اصول کو ختم کرکے ''ایک شخص ایک ووٹ'' کا اصول نافذ کیا گیا جس کی بنیاد پر ۱۹۷۰ء کے انتخابات منعقد ہوئے۔

تاہم انتخابی نتائج نے پاکستانی معاشرے کی تقسیم کو ظاہر کردیا۔ اس میں زیادہ واضح خلیج ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کے درمیان نمایاں ہوکر سامنے آئی۔ عوامی لیگ جس نے مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی ۱۶۲/ میں سے ۱۶۰/ نشستیں حاصل کیں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں ایک بھی سیٹ حاصل نہیں کرسکی۔ دوسری طرف پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کی ۱۳۸/ میں سے ۸۱ نشستیں جیتیں۔ اس نے مشرقی پاکستان میں امیدوار تک کھڑے نہ کیے۔ اس آئینی اور سیاسی بحران کو فوجی آپریشن کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی جس سے صورتحال مزید خراب ہوگئی اور جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنی۔ پاکستان ایک قابلِ عمل وفاقی نظام کو تشکیل دینے میں ناکامی کے باعث اپنے قیام کی ایک چوتھائی صدی کے اندر ہی دولخت ہوگیا۔

مشرقی اور مغربی حصے کے عدم توازن کا مصنوعی انداز سے حل نکالنے اور برابری (Parity) کے غلط فارمولے کے علاوہ بھی ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر میں ایسے کئی نکات تھے جن کے ملکی اتحاد پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ان میں سب سے اہم شدید قسم کی مرکزیت تھی جس کو ان دساتیر نے رواج دیا۔ دونوں دساتیر میں اختیارات کی ایسی تقسیم کی گئی جس میں تمام اہم امور مرکز کے پاس رکھے گئے۔ حتیٰ کہ وہ امور بھی جو صوبوں کو دیے گئے ان میں بھی زیادہ تر پالیسی سازی مرکز کے پاس رہی۔ مزید یہ کہ مالی امور خاص طور پر مرکز کے پاس رکھے گئے اور صوبوں کو مالی معاملات میں مرکز پر انحصار کرنا پڑا۔

۱۹۷۳ء کے آئین کی وفاقیت

۱۹۷۳ء کا آئین کئی طرح سے اہمیت کا حامل ہے۔ پچھلے دو دساتیر کے برعکس یہ عوام کے منتخب نمائندوں نے بنایا۔ اسے آئین ساز اسمبلی میں موجود تمام سیاسی جماعتوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ آئین میں ایسے ادارے قائم کیے گئے جو وفاقی طرزِ حکومت میں عمومی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آئین نے دو ایوانی قانون ساز ادارہ تشکیل دیا جس میں ایوانِ زیریں، یعنی قومی اسمبلی، میں نمائندے براہِ راست عوام سے منتخب ہو کر آتے ہیں جبکہ ایوان بالا، یعنی سینیٹ، وفاقی اکائیوں کی برابری کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔

اسی طرح آئین نے وسائل کی تقسیم کا طریقہ کار طے کر دیا۔ اس میں مرکز اور صوبوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ادارے قائم کیے گئے۔ تاہم آئین ابھی بھی مرکزیت پسندی کی جانب مائل تھا۔ اسی حقیقت کے باعث، آنے والی دہائیوں میں سیاسی قیادت، خاص طور سے صوبائی خودمختاری کے علمبردار رہنما اور جماعتیں آئینی اصلاحات اور زیادہ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرتی رہیں۔ اصلاحات کی ضرورت آئین کی منظوری کے وقت سے ہی محسوس کی جاتی رہی تھی۔ اسی لیے آئین کو حتمی شکل دینے کے دوران اس وقت صدارت کے منصب پر فائز ذوالفقار علی بھٹو نے اپوزیشن سے وعدہ کیا تھا کہ دس سال بعد مکمل آئینی پیکج پر نظرثانی کی جائے گی۔ ایک موقع پر وہ اس بات پر قائل ہو چکے تھے اور دوسروں کو بھی قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آئین میں موجود مشترکہ مضامین کی فہرست (Concurrent List) کو دس سال بعد ختم کر دیا جائے گا اور اس میں درج مضامین صوبوں کے حوالے کر دیے جائیں گے۔

عدم مرکزیت کا مطالبہ سیاسی جماعتوں کے منشوروں میں اہم جگہ حاصل کرتا رہا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کی منظوری کے بعد دونوں فوجی حکومتوں کے دوران سیاسی قائدین کے درمیان جو اتحاد قائم ہوئے، خواہ وہ بحالی جمہوریت کی تحریک (MRD) ہو جو کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں شروع کی گئی یا میثاق جمہوریت ہو جس پر ۲۰۰۶ء میں پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (نواز) کے درمیان دستخط ہوئے، یا پھر اس کے نتیجے میں لندن میں ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس ہو، ہر موقع پر صوبائی خودمختاری کا مطالبہ، بحالیٔ جمہوریت کے تصور کا لازمی حصہ قرار پایا۔ اس مطالبہ کو ۲۰۰۸ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی سویلین حکومت میں زیرِ غور لایا گیا اور اٹھارہویں آئینی ترمیم کی صورت میں اس پر عمل درآمد کیا گیا۔ اٹھارہویں ترمیم کو پاکستان کے وفاقی آئین کی نوعیت میں ایک اہم تبدیلی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اٹھارہویں ترمیم کے بعد پاکستان میں وفاقیت:

اٹھارہویں آئینی ترمیم پاکستان کے وفاقی طرزِ حکومت کی نوعیت میں بڑی تبدیلی کا سبب بنی اور اس میں کافی حد تک عدم مرکزیت آ گئی۔ اس ترمیم کے تحت آئین میں ہونے والی تبدیلیوں کا دو طرح سے تجزیہ کیا جا سکتا ہے، اوّل، مرکز اور صوبوں کے تعلقات اور دوم، بین الصوبائی تعلقات کے حوالے سے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا اٹھارہویں آئینی ترمیم نے صوبوں اور مرکز کے تعلقات کی نوعیت میں نمایاں تبدیلی متعارف کی۔ یوں آئین شدید مرکزیت سے عدم مرکزیت کی جانب مائل ہوا۔ کم از کم آٹھ ایسے شعبوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جن میں مرکز اور صوبوں کے تعلقات میں فرق پڑا۔

پہلا، اٹھارہویں آئینی ترمیم کے بعد پارلیمنٹ پاکستانی ریاست کی وفاقی نوعیت کی زیادہ عکاس نظر آتی ہے۔ سینیٹ کی نمائندگی میں اضافہ کیا گیا جس سے صوبوں کو زیادہ آواز ملی۔ اسی طرح گورنروں کی تعیناتی کے صدارتی اختیار میں تبدیلی کی گئی۔ پہلے وہ وزیرِ اعظم کی ''مشاورت'' (consultation) سے تعیناتی کرتا تھا اب وزیرِ اعظم کی 'سفارش' (recommendation) پر کرتا ہے۔ پہلی صورت میں حتمی اختیار صدر کے پاس تھا۔ اب یہ اختیار وزیرِ اعظم کے پاس ہے جو پارلیمنٹ سے منتخب ہوتا ہے۔ نیز آئین کی ایک اور شق کی رُو سے صدر، وزیرِ اعظم کی سفارش کو رد نہیں کر سکتا۔ اس سے ایک طرف تو پارلیمانی نظامِ حکومت کو مضبوطی ملی تو دوسری طرف منتخب انتظامیہ کی صوبوں سے قربت میں اضافہ ہوا۔

دوسرا، صوبوں اور مرکز کے انتظامی تعلقات پر نظرثانی کی گئی۔ پہلے، آرٹیکل ۱۴۴ر میں پارلیمنٹ کو ایک یا زیادہ صوبوں کے بارے میں ایسے موضوعات پر قانون سازی کا اختیار حاصل تھا جو کہ وفاقی لسٹ میں شامل نہ ہوں۔ اب اس میں ترمیم کر کے صوبائی اسمبلی کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کی جانب سے کسی ایسی قانون سازی کو ختم یا اس میں ترمیم کر سکے۔ اسی طرح آرٹیکل ۱۴۷ر میں صوبوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے دائرہ کار میں آنے والے انتظامی اختیارات کو مرکز کو سونپ سکتے ہیں۔ اب اس میں اضافہ کیا گیا ہے کہ صوبائی حکومت کو مرکز کو سپرد کیے گئے اختیارات کی ساٹھ (۶۰) دن کے اندر صوبائی

اسمبلی سے توثیق کرانی ہوگی۔

تیسرا، آئین کی وفاقی نوعیت میں اہم تبدیلی قانون سازی کے اختیارات کی تقسیم میں ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اقدام مشترکہ فہرست (Concurrent List) کا خاتمہ اور مشترکہ مفادات کی کونسل کے اختیارات میں اضافہ ہے۔ کنکرنٹ لسٹ کے خاتمے سے بعض امور وفاقی فہرست کے حصہ دوئم میں منتقل نہیں کیے گئے جو کہ مشترکہ مفادات کی کونسل کے دائرۂ کار میں آتے ہیں۔ اسی طرح وفاقی لسٹ کے حصہ اوّل میں آنے والے کچھ امور کو حصہ دوئم میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس میں سائنسی اور تکنیکی تحقیق کی منصوبہ بندی اور رابطہ شامل ہیں۔ اسی طرح کچھ امور کو وفاقی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں بین الاقوامی معاہدے، کنونشن اور بین الاقوامی امور شامل ہیں۔

مزید یہ کہ کنکرنٹ لسٹ کے خاتمے کے بعد جن امور کو وفاقی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا وہ ان بقایا امور کا حصہ بن گئے ہیں جن پر صوبوں کا مکمل اختیار ہے۔ کنکرنٹ لسٹ کے خاتمے کے اہم فیصلے کے بعد سترہ (۱۷) وفاقی وزارتیں ختم ہوگئیں۔ اس سے صوبوں کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوا اور انہیں کم از کم چونتیس (۳۴) نئی ذمہ داریاں سپرد کی گئیں۔

چوتھا، اٹھارہویں ترمیم کے بعد مشترکہ مفادات کی کونسل ایک زیادہ اہم ادارہ بن گیا ہے اور اس کے ارکان اور ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ کونسل کی صدارت وزیرِ اعظم کرتے ہیں۔ چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور تین وفاقی ممبر کونسل کا حصہ ہوتے ہیں۔ مشترکہ مفادات کی کونسل کا الگ سیکریٹریٹ ہے۔ کونسل کی تشکیل وزیرِ اعظم کے انتخاب کے تیس (۳۰) دن کے اندر کرنا ضروری ہے اور اس کا ہر تین ماہ میں کم از کم ایک اجلاس ہونا لازم ہے۔ مشترکہ مفادات کی کونسل کی ذمہ داریوں میں وفاقی فہرست کے حصہ دوئم میں شامل امور پر پالیسیوں کی تشکیل اور قانون سازی شامل ہیں۔ اس کی ذمہ داریوں میں متعلقہ اداروں کی نگرانی بھی شامل ہے۔

پانچواں، بین الحکومتی تعلقات میں ایک اور اہم ادارہ قومی اقتصادی کونسل ہے۔ اس ادارے کے تیرہ (۱۳) ارکان ہوتے ہیں جن میں وزیرِ اعظم، چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ، چاروں صوبوں سے متعلقہ وزیرِ اعلیٰ کی جانب سے نامزد ایک ایک ممبر اور وزیرِ اعظم کے نامزد کردہ چار ارکان شامل ہوتے ہیں۔ قومی اقتصادی کونسل بنیادی طور پر ایک مشاورتی ادارہ ہے جو کہ چاروں صوبوں اور وفاقی حکومت کی اقتصادی پالیسیوں میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

چھٹا، اٹھارہویں ترمیم کے بعد قومی مالیاتی کمیشن کا کردار بھی بڑھ گیا ہے اور صوبوں کو پہلے کی نسبت زیادہ مضبوط بنا دیا گیا ہے۔ یہ لکھ دیا گیا ہے کہ این ایف سی ایوارڈ میں صوبوں کا حصہ اس سے کم نہیں ہوگا جتنا کہ پچھلے ایوارڈ میں رکھا گیا تھا۔ قومی مالیاتی کمیشن کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کو ایوارڈ پر عملدرآمد کی صورتحال پر رپورٹ پیش کرنا ہوتی ہے۔

ساتواں، کسی صوبے میں ایمرجنسی کے نفاذ کے حوالے سے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اس کا نفاذ متعلقہ صوبائی اسمبلی کی قرارداد کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ مزید یہ کہ اگر صدر کسی صوبے میں اپنے طور پر ایمرجنسی نافذ کرتا ہے تو اس کی دس روز کے اندر اندر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے توثیق ضروری ہے۔

آٹھواں، صوبوں کی معاشی اور مالی پوزیشن میں بہتری کی ایک اہم شق، بعض وسائل کی مشترکہ ملکیت سے متعلق ہے۔ چنانچہ آرٹیکل ۱۷۲ کی شق ۲ میں کہا گیا ہے کہ کسی صوبے میں پائی جانے والی معدنیات یا قدرتی گیس پر صوبے اور وفاقی حکومت کا مشترکہ حق ہوگا۔

اٹھارہویں ترمیم میں اوپر بیان کی گئی تبدیلیوں سے پتا چلتا ہے کہ پاکستان میں وفاقیت اس وقت اس سے بہت مختلف ہے جو اس ترمیم کے منظور ہونے سے قبل تھی۔

مرکزی اور صوبائی دائرۂ کار کی واضح حد بندی کے بعد، یہ توقع کی جاتی ہے کہ صوبوں کے درمیان تعلقات بھی نئی وفاقیت کی روح کے مطابق چلائے جائیں گے۔ تاہم انسانی معاشرے کبھی بھی مسائل سے آزاد نہیں ہوتے۔ اس لیے مستقبل میں صوبوں کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات اور کام کے حوالے سے مسائل کھڑے ہوسکتے ہیں۔ کسی آئینی شق کی مختلف صوبے اپنے مطابق مختلف تشریح کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں ایسے امور کو مختلف اداروں مثلاً سینیٹ، پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس یا براہِ راست مشترکہ مفادات کی کونسل میں حل کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ اٹھارہویں ترمیم نے متعدد امور کا احاطہ کیا ہے اور صوبوں کے طویل المدتی مطالبات کے بعض مثبت حل پیش کیے ہیں لیکن نئی وفاقیت کو کئی چیلنجوں کا بھی سامنا ہے جنہیں مرکز اور صوبوں میں موجود سیاسی قیادتوں اور جماعتوں کو حل کرنا ہے۔ آئینی شقیں زیادہ سے زیادہ ایک طریقۂ کار طے کر سکتی ہیں اور ریاست کا انتظام چلانے کے لیے اصول وضع کر سکتی ہیں۔ تاہم ان کو سمجھنے، عملدرآمد اور ان کی عملی تشریح ان افراد پر منحصر ہوتی ہے جو ان کو چلا رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے بہت زیادہ انحصار ان افراد کے سیاسی عزم پر ہے جو اس عدم مرکزیت پر مبنی وفاقی نظام کو چلا رہے ہیں یا آئندہ چلائیں گے۔ چونکہ نظام پہلے مرکزیت پر مبنی تھا اس لیے ان افراد کی ذہنیت کو بھی تبدیل ہونے کی ضرورت ہے۔ ماضی کی آمرانہ اور مرکزیت پر مبنی ذہنیت نئے آئینی انتظام کے ساتھ نہیں

چل سکتی۔ اسی طرح نئی وفاقیت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ان امور پر صوبوں کی استعدادِ کار میں بھی اضافہ کیا جائے جہاں نئی صوبائی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے ان کے پاس استعداد موجود نہیں۔

اٹھارہویں ترمیم کی کارکردگی:

پاکستان میں وفاقیت طویل مدت کے ارتقائی عمل سے گزری ہے۔ یہ مشکل مراحل سے گزری ہے اور کئی غلطیوں اور مشقوں سے ہو کر آگے بڑھی ہے۔ اٹھارہویں ترمیم ایک سنگ میل ہے، اور ایک اہم سنگ میل ہے مگر یہ کہنا بہت بڑا دعوی ہوگا کہ اس ترمیم کے بعد ہمارا وفاقی نظام ایک مکمل وفاقی نظام بن گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی دستور میں وفاقیت کی روح کی کارفرمائی کے نقطۂ نظر سے ترمیم و اضافے کی بڑی گنجائش موجود ہے۔ پھر یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اٹھارہویں ترمیم کو کتابِ دستور کا حصّہ بنے ہوئے اب آٹھ سال ہو رہے ہیں۔ یہ اتنی مدت ضرور ہے کہ عوام یہ دیکھیں کہ اس ترمیم کے نتیجے میں اُن کی زندگیوں میں کیا معنوی تبدیلی آئی ہے۔ یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ اس دوران کیا صوبوں کی کارکردگی میں اضافہ ہوا ہے؟ صوبے کئی عشروں سے خودمختاری کا مطالبہ کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں تمام قانونی اور سیاسی ذرائع کا استعمال بھی کیا۔ پھر صوبوں سے تعلق رکھنے والی سیاسی قیادتوں اور جماعتوں نے خودمختاری کے حصول کے لیے طویل اور صبر آزما جدوجہد بھی کی۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اٹھارہویں ترمیم کی صورت میں جو اختیارات صوبوں کو حاصل ہوئے وہ صوبوں اور ان کے عوام کے نقطۂ نظر سے کتنے نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں بہرحال یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ صوبوں کو نئے اختیارات پر عملدرآمد کے ضمن میں دشواریاں کون کون سی پیش آئیں اور ان دشواریوں کو دور کرنے کے لیے مرکز اور صوبوں نے کیا کام کیا؟

جہاں تک اٹھارہویں ترمیم کے عملی حاصلات کا تعلق ہے، یہ کہنا بجا ہوگا کہ کچھ شعبوں میں یقیناً صوبوں کی صورتِ حال بہتر ہوئی۔ صوبوں کے مالیاتی وسائل میں اضافہ ہوا اور بعض صوبوں نے ان اضافہ شدہ وسائل کو استعمال میں لا کر چند ایک شعبوں میں کم از کم مقداری اضافہ کیا۔ بنیادی ڈھانچے (Infra structure) کی تعمیر میں بھی ترقی دیکھی گئی گو کہ یہ بھی سب صوبوں میں ایک سطح پر نہیں ہوئی۔ پنجاب میں سڑکوں اور برسرِ سڑک ٹرینوں کی تعمیر کی گئی۔ خیبر پختونخوا میں بھی سڑکوں کی تعمیر دیکھی جا سکتی ہے۔ تعلیمی اداروں کی تعمیر و توسیع (معیارِ تعلیم سے قطعِ نظر) بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ دیکھی گئی۔ مگر یہ حاصلات، صوبوں کے تقاضوں اور صوبائی حکومتوں کے دعووں کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ تمام شعبہ جات کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے تو کم از کم تین حقائق سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم حقیقت تو یہ ہے کہ کرپشن ہمارے جملہ شعبہ ہائے حیات کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔ جب اختیارات اور وسائل بڑی حد تک مرکز کے پاس تھے، تو کرپشن کی عملداری مرکز میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی تھی۔ اب اختیارات اور وسائل صوبوں کی طرف بھی آئے ہیں تو اپنے ساتھ کرپشن کا رجحان بھی لائے ہیں اور صوبے جو پہلے بھی کرپشن سے محفوظ نہیں تھے، کرپشن کے نئے منطقوں کو چھو رہے ہیں۔

دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ اختیارات کی مرکز سے صوبوں کو منتقلی بجائے خود کوئی انقلاب آفریں بات نہیں ہوتی۔ اصل بات اختیارات اور وسائل کی عدم مرکزیت کا تصور ہے جس کا تقاضا ہے کہ اختیارات اور وسائل مرکز سے صوبوں تک آنے کے بعد، صوبوں ہی کی سطح پر نہ رک جائیں بلکہ صوبوں سے نیچے اُتر کر مقامی حکومتوں اور گلی محلّے تک پہنچیں۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں جب کبھی صوبے کو کوئی اختیار ملتا ہے تو صوبائی حکومت، صوبائی بیوروکریسی، اور یہاں تک کہ صوبائی اسمبلیاں بھی اس اختیار کو اپنے تک رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ خاص طور سے مالیاتی وسائل کو نچلی سطح تک پہنچانے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک عام شہری مرکز سے اختیارات کے صوبوں تک آنے پر، کم از کم اپنی روزمرہ کی زندگی میں کوئی خاص بہتری نہیں محسوس کرتا۔

تیسری اہم حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ آٹھ برسوں میں یہ بھی نظر آیا کہ بعض صوبوں نے نئے اختیارات کو روبہ کار لانے میں دشواری محسوس کی۔ صوبوں کے پاس ہر شعبے میں نہ تو فعال افراد موجود تھے اور نہ ہی ان کے پاس نئے نظام کو احسن طریقے سے چلانے کی صلاحیت (capacity) موجود تھی۔ جہاں جہاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ صلاحیت پیدا کر لی گئی، وہاں کارکردگی بہتر ہوتی گئی اور اٹھارہویں ترمیم کے حاصلات نظر آنے لگے۔ مگر جہاں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی یا اس طرف توجہ نہیں دی گئی، وہاں نہ تو عوام کو دینے کے لیے کچھ ہے اور نہ اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لیے کوئی بہانہ دستیاب ہے۔

پاکستان میں عدم مرکزیت کی حامل وفاقیت اور صوبائی خودمختاری کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ جہاں اس عدم مرکزیت کے سفر کو جاری رکھا جائے وہیں جو آئینی اصلاحات اب تک ہوئی ہیں اُن کو اُن کی روح کے مطابق روبہ عمل لایا جائے۔ اس سلسلے میں بنیادی کردار سیاسی جماعتوں کو ادا کرنا ہوگا کیونکہ وہی ایک جمہوری معاشرے میں شہریوں اور ریاست کے درمیان واسطے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں سول سوسائٹی کا کردار بھی مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سول سوسائٹی کی تنظیمیں ہی ہیں جو حکومتوں کی کارکردگی پر نظر رکھتی اور ان کو اصلاحِ احوال کے لیے مشورے دیتی ہیں۔ پاکستان میں وفاقی نظام کی کامیابی کا دارومدار بھی بڑی حد تک انہی دونوں حلقوں پر ہے۔ ☆☆

پاکستان، حکمرانی کا بحران

زاہد اسلام: لاہور <zahidislam101@gmail.com>

برائے بحث

ابتدائیہ:

☆..... یوں تو پاکستان روز اوّل سے ہی حکمرانی کے بحرانوں کا شکار چلا آرہا ہے مگر حالیہ بحران کی نوعیت خطرناک صورتحال کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی میں ریاست کا ہر ادارہ، سویلین معاشرے کے منظم ادارہ جاتی مظاہر (سیاسی جماعتیں ذرائع ابلاغ اور دوسرے سویلین ادارے) معاشرت، سیاست، معیشت، ثقافت، ماحول اور نفسیاتی فضا۔ غرضیکہ ہر جگہ بحرانی کیفیت برپا ہے۔ ''بحرانی کیفیت'' سے مراد ہے جب تضادات ہوں جو قدرتی ہوتے ہیں مگر ان کی مینجمنٹ نہ ہو پا رہی ہو۔ متضاد اور متحارب قوتیں اور عناصر کسی متفقہ فریم ورک پر اتفاق رائے نہ کر پائیں تو بحران پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ بحران بعض اوقات محدود نوعیت کے ہوتے ہیں مگر بسا اوقات ہمہ گیر ہوتے ہیں، جن کی کئی جہتیں ہوتی ہیں۔

☆..... پاکستان کا حکمرانی کا بحران ہمہ گیر ہے۔ اس کا دیرپا حل نہیں نکالا جاسکا تاہم کبھی عارضی حل تلاش کر لیا جاتا ہے جس کی بنا پر عارضی ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ پھر وہیں سے شروع ہو جاتا ہے اس بحران کی تاریخی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی بنیادیں یقیناً ہوں گی اور لازمی ہوتی بھی ہیں تاہم ہمارے ہاں ان بنیادی وجوہات کو تسلیم کر کے کسی مناسب حل کی تلاش اور جستجو میں شدت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے حالات خود روی کا شکار ہوتے ہیں۔ معروضی دباؤ کے آگے موضوعی کوششیں ماند پڑ جاتی ہیں، کئی ایک پہلو ہیں، لاتعداد ایشوز ہیں جن پر بحث و مباحثہ، غور و فکر اور کسی پائیدار حل کی ضرورت ہے۔ اب حمزہ علوی کا نظریاتی فارمولیشن من وعن متعلقہ نہیں رہا ہے۔ گو کہ اس صدی کے دوسرے نصف کی ابتدائی دو دہائیاں ویسی ہی شکل ہیں جیسے جناب حمزہ علوی نے فرمایا تھا۔ ہمارے ملک کے نظریاتی ترقی پسندوں کی بڑی کھیپ عجیب لوگوں پر مشتمل ہے جب حمزہ علوی کا تجزیہ بالکل درست تھا ہمارے نظریاتی دانشور اسے ''طبقات سے ماورائے ریاستی نظریہ'' کہہ کر رد کرتے رہے اور حمزہ علوی سے اتفاق کرنے والے اقلیت بنے رہے۔ آج جب محترم حمزہ علوی کا نظریہ اپنی مطابقت کھو بیٹھا ہے اس میں تبدیلی ضروری ہے۔ بدلتی ہوئی حقیقتوں کا ادراک کرنا ضروری ہے۔ پھر صحیح نتیجے نکل سکیں گے۔ یہ بات درست ہے کہ جامد نظریہ پھر عقیدہ بن جاتا ہے۔ اگر معروض میں ہر لمحہ برپا ہونے والی تبدیلیوں کی وجوہات کو نظرانداز کر دیا جائے۔

☆..... یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ پاکستان کو 70 سال گزر گئے ہمارے معاشرے میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں مگر ہماری نظریاتی فارمولیشن میں ان تبدیلیوں کو تسلیم نہ کیا جاسکے۔ معاشرے جہاں پہنچ جاتے ہیں وہاں سے واپسی نہیں ہوتی بلکہ اگلی پیش رفت لازمی ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ ارتقا ہو یا زوال ہو یہ بنیادی نظریہ ہونا چاہئے کہ ہمارے سماج میں ہر وقت کشمکش اور تضادات میں ٹکراؤ اور ہم آہنگی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ کچھ غائب ہو رہا ہے اور کچھ نیا پیدا ہو رہا ہے۔ حالات، مظاہر، عناصر جوں کے توں نہیں ہیں۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے اور پھر اپنے ملک میں جاری سیاسی کشمکش کا جائزہ لیں تو نئی گروپ بندی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

☆..... دور حاضر میں سوشل میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا رائے عامہ پر گہرے اثرات ڈالتا ہے اور یہ جدید سرمایہ داری معاشرے میں ایک اہم ذریعہ ہے۔ جس سے لکھو کا عوام کو ایڈریس کیا جاسکتا ہے اور کوئی مخصوص پیغام بھی پہنچایا جاسکتا ہے۔ تاہم اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو افراد، گروپ یا گروہ ابلاغ عامہ کے ان ذرائع میں رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ یکطرفہ بیان بازی کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے مخاطب سامعین یا ناظرین کا فیڈ بیک نہیں ملتا جو ان کی سچائی یا اصلاح میں مددگار ہو۔ اسی طرح اب یہ کوئی معیار نہیں کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ بس جسے موقع ملا وہ کہے جا رہا ہے۔ بہت بڑی بڑی باتیں بھی کہی جاتی ہیں..... ایک صاحب جو کبھی کسی بھی سطح پر کسی بھی سیاسی جماعت کے رکن یا کارکن کبھی نہ رہے ہوں وہ پارٹی سیاست پر ایسے تبصرہ کر رہے ہوتے ہیں جیسا بہت تجربہ کار ہوں

اسی طرح آئینی، قانونی، عالمی، ثقافتی، فلسفیانہ اور خارجہ امور پر کوئی بھی بات کر سکتا ہے کسی دلیل یا تجربہ یا تعلیم کی ضرورت نہیں ہے، مگر نیم حکیموں کی بڑی سے بڑی گزارشات عوامی ذہن پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔ کیسا ماحول پروان چڑھتا ہے، دوررس نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں اس پر غور وفکر کوئی نہیں کرتا۔

پاکستانی سماج کا جائزہ

☆..... پاکستانی سماج کا ایک روایتی جائزہ ابھی تک چلا آرہا ہے۔ جس کے مطابق پاکستان میں جاگیرداری مرکزی اور محوری نظام معیشت ہے اور اس کے ساتھ سرمایہ داری ہے۔ جس میں صنعتی اشرافیہ، کاروباری طبقہ موجود ہے اور پھر بہت بڑی تعداد غریب عوام کی ہے جس میں صنعتی مزدور ہیں۔ کھیت مزدور ہیں، بے زمین کسان ہیں اور دیہاتوں، شہروں میں بیروزگار یا ذیلی، نچلے کاروبار سے منسلک لاتعداد غریب لوگ ہیں۔ ان دونوں اوپری اور نچلی پرت میں درمیانہ طبقہ آتا ہے جس میں بڑی تعداد ملازمت پیشہ لوگ ہیں، جبکہ چھوٹے کاروباری اور چھوٹے درمیانہ مالکان جائیداد، صنعت، اراضی بھی درمیانہ طبقہ کی خوشحالی پرت کا حصہ ہیں۔ یہ تجزیہ روایتی طور پر درست رہا ہے اور حقیقی صورتحال بھی یہی رہی ہے، مگر جوں جوں نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ سرمایہ داری نظام کے تحت عالمگیریت نے ہمارے ملکوں میں بھی بنیادی نوعیت کی معاشرتی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ ہمارے ممالک اب مفاداتی گروہوں پر مشتمل سماج بن گئے ہیں۔ یہ مفاداتی گروہ آپس میں کسی نہ کسی مخصوص، معاشی اور سیاسی مفادات کے ذریعے مربوط ہیں اور ان مفاداتی گروپوں کی جتھہ بندیاں ماورائے طبقات ہیں۔ مثلاً درمیانہ طبقے کے لوگ اگر رئیل اسٹیٹ کے بزنس یا بین الاقوامی تجارت، سمگلنگ میں شامل ہو جائیں تو ان کے پاس اتنی دولت آجاتی ہے کہ وہ خود بھی ایک خاص مفاداتی گروہ بن جاتے ہیں، حالانکہ ذرائع پیداوار سے ان کا خاص تعلق نہیں ہوتا اسی طرح صنعتی مزدور بہت سکڑ گئے ہیں اور اسی طرح صنعتی سرمایہ دار بھی اب کمرشل کاروباری طبقے کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ یہی ٹوٹ پھوٹ نچلے طبقات میں ہو رہی ہے۔ روایتی محنت کش طبقات (مزدور کسان) اب نئی شکل اختیار کر رہے ہیں، کیونکہ ان کی پیداواری سرگرمیاں اب زراعت اور صنعت سے نکل کر دوسری نوعیت کی معیشت میں ڈھل چکی ہیں۔ اب ہمیں شہری زندگی میں کثیر تعداد میں غریب عوام نظر آتے ہیں جن کی مصروفیات غیر روایتی شعبوں کی طرف منتقل ہو رہی ہیں اور وہ خود بھی کسی نہ کسی مفاداتی گروہ کا حصہ بن رہے ہیں۔

سیاسی میدانوں میں اس تبدیلی نے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے حکمران جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں بلکہ مخصوص مفاداتی گروہ حکمران بن گئے ہیں اور کئی مفاداتی گروہ ان کے ساتھ کشمکش میں نظر آتے ہیں۔ دونوں فریقین میں ہمیں مختلف طبقاتی پس منظر کے حامل افراد اور گروہ متحد نظر آتے ہیں۔ آج کے سماج میں جدید مفاداتی گروہوں میں امرا بالادست ہیں مگر ان امرا میں صرف جاگیردار اور سرمایہ دار ہی شامل نہیں ہیں، بلکہ ایک زیادہ وسیع حلقہ حکمرانی میں حصہ دار ہے اس وسیع حلقہ کی تعریف ضروری ہے۔

☆..... اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ہمارا معاشرہ مختلف مفاداتی گروپوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہے اور یہ مفاداتی گروپ بین الاقوامی ڈھانچہ جاتی ہے۔ یعنی مفادات ہر تنظیم اور ریاستی ڈھانچہ میں یکساں اثر ورسوخ کے حامل ہیں، کسی ایک ادارے کی کسی ایک گروپ میں جامد وساکت کیفیت نہیں ہے بلکہ سماج میں جاری کشمکش ہر جگہ، ہر سطح پر اپنا کچھ نہ کچھ اثر رکھتی ہے۔ ان مفاداتی گروپوں نے اب حکمرانی کا سرکل چن لیا ہے۔ وہ حکمرانی کی ہر شکل میں اپنے قدم جمانے کے چکر میں ہیں۔ اس قبضہ گیری اور اثر ورسوخ حاصل کرنے کی کشمکش ان کے مابین محاذ آرائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان میں طاقتور مفاداتی گروپ اب مافیاز بن گئے ہیں۔

☆..... پاکستان جیسے ممالک میں جہاں ریاستی اشرافیہ زیادہ منظم، مضبوط اور طاقتور تھی وہ ایک بڑے لمبے عرصہ تک ملک کی حکمرانی میں براہ راست یا برائے راست حصہ دار بنتی چلی آئی ہے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی حیثیت، نوعیت اور ساخت میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں یہ سویلین معاشرہ سے الگ تھلگ، اپنے خول میں بند اشرافیہ تھی مگر جوں جوں پاکستان کے دیگر حکمران طبقات نے بین الاسطحی پھیلاؤ اختیار کیا ہے ریاستی اشرافیہ میں بھی شکست وریخت ہوئی ہے، مفادات کے حوالہ سے اور نظریاتی اور سیاسی اثرات کا شکار بھی ہوئی ہے۔ اب ہم سویلین معاشرہ اور ریاستی اشرافیہ دو باہم متضاد اکائیوں کی شکل میں نہیں دیکھتے۔ درمیانہ طبقہ بھی خوب پھیلا ہے اور حکمرانی میں حصہ دار بن گیا ہے بلکہ کئی شکلوں میں فیصلہ کن حیثیت روایتی درمیانہ طبقہ کو ہی حاصل ہے اور بسا اوقات روایتی حکمران طبقات جاگیردار جواب بڑے زمیندار ہیں اور سرمایہ دار جواب مالیاتی اشرافیہ بن چکی ہے جس کے زیر تصرف صنعتی سرمایہ کی بجائے مالیاتی سرمایہ ہے کے اوپر درمیانہ طبقہ کو حاوی حیثیت میں

دیکھا جاتا ہے۔ درمیانہ طبقہ میں تنخواہ دار بھی شامل ہیں۔

آج کی جمہوریت جو ہمارے ہاں رائج ہے وہ کیا ہے؟

☆..... یہ بات درست ہے کہ دور حاضر میں جمہوریت کے متبادل یا مترادف کوئی دوسرا سسٹم موجود نہیں ہے مگر جمہوریت کیا ہے؟ یہ بحث طلب بات ہے بعض لوگوں کے نزدیک جمہوریت ایک طرز حکومت ہے جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں۔ یعنی اکثریت کی حکومت ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک جمہور کا حق حکمرانی ہے جو انتخابات کے ذریعے اپنے نمائندوں کے توسط سے ریاستی نظم و نسق چلاتے ہیں۔ بعض روایات پرست اسے سرمایہ دار اور دولت مند طبقے کی حکومت بھی کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک یہ مغربی طرز حکمرانی ہے جبکہ مسلمانوں کے اکثریتی ممالک میں طرز حکمرانی مختلف ہوتی ہے، تاہم چند باتیں سارے انداز فکر میں مشترک ہے کہ! جمہوریت ایسی منتخب طرز حکمرانی ہے جہاں جمہور خود اپنے میں سے اپنے نمائندوں کو منتخب کریں جو ریاست میں جا کر جمہور کی فلاح و بہبود کے لئے کام کریں۔

☆..... جمہوریت کا تعلق طرز حکمرانی سے ہے اس بات سے قطع نظر کہ جمہوری انداز فکر بھی منفرد حیثیت کا حامل ہے، جس میں اکثریت کو تسلیم کرنا مگر اقلیت کے وجود سے بھی اقرار کرنا شامل ہے اور یہ تسلیم کرنا بھی شامل ہے کہ جمہوریت میں قانون کے مطابق ہر شخص کو سوچنے، عمل کرنے اور دیگر بنیادی حقوق مساوی طور پر حاصل ہوتے ہیں۔

اسی طرح جمہوری انداز حکمرانی میں بھی چند بنیادی لازمی عناصر ہیں۔

1- سیاسی تنظیم سازی یا سیاسی جماعتوں کا وجود۔

2- شہریوں کا آزادانہ حق رائے دہی۔

3- شفاف، صاف انتخابی عمل

4- احتساب کا معقول اور مناسب نظام۔

اب آیئے ذرا پاکستانی تجربہ میں ان عناصر کا جائزہ لیں۔

☆..... سیاسی جماعتوں کا بغیر کسی پروگرام، منشور اور نصب العین کے اقتدار میں رہنا یا اقتدار میں آنے کے کوششیں کرنا۔ اس مقصد کے لئے ہر طرح کے اتحاد، جوڑ توڑ، خرید و فروخت، حتیٰ کہ سازش بھی کر لینا عوام کا نام لینا مگر کبھی عوام کے مسائل کو ترجیح بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔

☆..... جمہوریت سے مراد ہے عوام کے منتخب نمائندوں کی حکومت جو نہ تو عوام میں سے ہوتی ہے، بلکہ خواص پر مشتمل ہوتی ہے جو اپنے اپنے علاقوں میں سیاسی لارڈ ہوتے ہیں اور بعض گدی نشین بھی ہوتے ہیں بعض (ریٹائرڈ) جرنیل، جج اور سرکاری افسران ہوتے ہیں یا ان کے رشتہ دار ہوتے ہیں مگر انہیں (Electables) ہونے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے اور وہ کبھی ایک پارٹی میں کبھی دوسری پارٹی میں اپنی صوابدید یا مفاد دیکھ کر یا ہوا کا رُخ دیکھ کر شامل ہوتے رہتے ہیں۔

☆..... جمہوریت سے مراد ایسی اسمبلیاں اور پارلیمنٹ ہیں جہاں کبھی بنیادی پالیسی سازی نہیں ہوتی۔ البتہ قانون سازی ہوتی ہے مگر ایسے کہ آدھے سے زیادہ ارکان نہ تو کارروائی کا حصہ بنتے ہیں نہ ان کی رائے کا کوئی اظہار نظر آتا ہے۔ البتہ ہاتھ اُٹھا کر ووٹ ڈالتے ہیں، اکثر اوقات کورم مکمل نہیں ہوتا۔ حکومتی اہلکار بھی انہیں سیریس نہیں لیتے۔ وزیراعظم اور وزراء تو کبھی کبھار ہی اس کی کارروائی کا حصہ بنتے ہیں۔

☆..... سیاسی جماعتیں کیا ہیں؟ کوئی منشور، نصب العین، انتخابی پروگرام واضح نہیں۔ قیادت منتخب ہوتی ہے۔ مگر بلا مقابلہ انتخاب کے ذریعے، پارٹی کے ادارے ہوتے ہیں مگر زیادہ تر نامزد افراد پر مشتمل اور نان فنکشنل، رکنیت کا باقاعدہ حساب بھی کم ہے۔ دفاتر کم ہیں، پارٹی کے اندر معلومات کا مناسب ذریعہ برائے آگہی نہیں۔ پارٹی کیڈر تربیتی سکول نہیں ہیں، پارٹی فنکشنگ اس حد تک محدود ہے جہاں تک الیکشن کمیشن کا دباؤ مجبور کرتا ہے۔

☆..... سیاسی قیادت، حکمرانی کے انداز میں اختیارات اور طاقت کا سرچشمہ افراد یا وہ بھی فرد واحد کی شکل میں ہے۔

☆..... اگر ہم جدید پاکستان کا منظر نامہ 1970ء کے بعد سے دیکھیں تو بالکل واضح ہے کہ 1970ء کے عام انتخابات جو اپنی نوعیت میں پہلے عام انتخابات تھے کی وجہ سے ہماری ملکی سیاست اور معیشت میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ پاکستان کی جغرافیائی حیثیت تبدیل ہوگئی۔ ون یونٹ کی وحدانیت ایک جمہوری وفاق میں تبدیل ہوگئی۔ صدارتی طرز حکومت کی جگہ پارلیمانی جمہوریت آگئی۔ ایک نیا دستور بن گیا اور دستور کے تحفظ کی شکل بھی نکل آئی۔ ریاستی تنظیم سازی میں بنیادی تبدیلیاں آئیں، نئے جدید ادارے وجود میں آئے۔ سیاسی جماعتیں برسر اقتدار آئیں بلکہ عوام کی وسیع شکل میں حمایت بھی متحرک نظر آتی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت پاکستان کی تاریخ کی مضبوط ترین حکومت تھی

جبکہ ماضی کی ریاستی اسٹیبلشمنٹ اپنی کمزور ترین حیثیت میں موجود تھی، تاہم سیاسی لیڈرشپ کی بعض غلط پالیسیوں اور اقدامات نے صورتحال کو بدل دیا اور ایک بار پھر مارشل لا آ گیا، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ریاستی اسٹیبلشمنٹ کو پھر سیاسی انتظامی مداخلت کے مواقع ہاتھ آ گئے تاہم اب کی بار سیاسی قیادت کی مزاحمت جاری رہی اور مزاحمت بھرپور شکل بھی اختیار کر گئی۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے چند بنیادی غلطیاں کیں جن کا فائدہ مخالفین نے اٹھایا۔

اول: سیاسی قوتوں کے مابین محاذ آرائی پروان چڑھائی جبکہ ان کے مابین اتحاد کی گنجائش موجود تھی۔ بنگلہ دیش بننے سے عوام میں جمہوری قوتوں کا بڑا حصہ الگ ہو گیا، لہٰذا ضروری تھا کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں موجود سیاسی قوتوں سے محاذ آرائی سے گریز کیا جاتا۔

دوم: نیشنلائزیشن کی پالیسی اختیار کی جو اس موقع محل کے اعتبار سے درست تھی مگر نیشنلائزیشن کا اطلاق بلا سوچے سمجھے کیا گیا مثلاً تعلیمی اداروں کو قومیا لیا گیا۔ چھوٹے موٹے پرائیویٹ سکول بھی سرکاری تحویل میں لے لئے گئے اسی طرح رائس ملیں، گھی ملیں، فلور ملیں اور کاٹن کی جننگ فیکٹریوں کو نیشنلائز کیا گیا جو خالصتاً قومی صنعت تھیں اور درمیانہ درجہ کی صنعت تھی۔ اس قومیانے کی پالیسی نے درمیانہ طبقہ کے کاروباری حصہ کو شدید مخالفت پر دھکیل دیا۔ گو کہ تنخواہ دار درمیانہ طبقہ بھٹو کے ساتھ رہا مگر مخالفین کے گروہ میں بھی وسعت آ گئی۔

سوم: مزدور کسان طبقہ میں بھی مخالفت اور دوریاں پیدا ہو گئیں کیونکہ برسر اقتدار آتے ہی کراچی میں دو بڑے صنعتی علاقوں میں فائرنگ ہو گئی (جون 1972ء اور اکتوبر 1972ء) پیٹ فیڈر بلوچستان، ہشت نگر صوبہ سرحد میں کسانوں کی تحریک چل پڑی مگر اس کی قیادت بھی پی پی پی کے ہاتھ میں نہ تھی پنجاب میں سرائیکی زمینداروں سے پارٹی تعلق نے بھی کسانوں کو غلط پیغام دیا۔

چہارم: شخصی آمریت پسندانہ رجحان نے پارٹی میں بہت سے بنیادی کارکنوں کو الگ ہونے پر مجبور کر دیا۔ مصطفیٰ کھر، معراج محمد خاں، حنیف رامے، خورشید حسن میر، جے اے رحیم، پنجاب کے بعض وزراء اور کارکن، میاں تاری وغیرہ اور پھر محمود علی قصوری ایسے رہنما تھے جو پارٹی سے دور ہوتے گئے۔

انہی وجوہات کی بنا پر پارٹی کی گرفت کمزور ہو گئی، حالانکہ بعض اقدامات اٹھائے گئے کہ مذہبی حلقوں کی مخالفت میں شدت نہ آئے۔ مثلاً جمعہ کی چھٹی، اسلامی کانفرنس کا انعقاد قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوانا وغیرہ مگر کوئی زیادہ فائدہ نہ ہوا۔

☆..... جنرل ضیاالحق کا مارشل اتنا طاقتور نہ تھا جتنا ایوبی مارشل لا تھا۔ گو کہ جمہوری کارکنوں کے خلاف ریاستی تشدد ماضی کی نسبت بہت زیادہ تھا، مگر سیاسی جماعتوں اور سیاسی قیادت پر انتہائی سختیوں کے باوجود ان کی سرگرمیاں رد کی نہ جا سکیں۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ سیاسی جماعتیں ماضی کی نسبت زیادہ طاقتور اور منظم ہو چکی تھیں اور عوام کی حمایت بھی پختہ ہو چکی تھی۔ ضیاالحق کی حکومت کو پاپولر حمایت میسر نہ آ سکی گو کہ اپنے آغاز میں بعض سیاسی جماعتوں نے اس کی حمایت کی اور اس کی حکومت کا حصہ بھی بن گئیں مگر جلد ہی الگ ہو گئیں۔ ضیاالحق نے ایوب خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی نئی سیاسی حمایت کے حصول کی کئی کوششیں کیں۔ ریفرنڈم کا سہارا لیا، شورائی بنائی، نئی سیاسی جماعت سامنے آئی۔ لوکل گورنمنٹ انتخابات کرائے جس کے ذریعے بہت نئے چہرے بھی سامنے آئے، تاہم سیاسی جماعتوں کی مقبولیت اور فعالیت کم نہ ہو سکی۔ پہلے لوکل گورنمنٹ انتخابات تو سیاسی جماعتوں نے جیت لئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ضیاالحق کو قانون میں تبدیلی لا کر سیاسی جماعتوں کے حمایت یافتہ منتخب کونسلرز کو باہر نکالنا پڑا۔

☆..... تحریک بحالی جمہوریت کی تشکیل اور اس کے ذریعے جدوجہد نے ضیاالحق کو خاصا دباؤ میں رکھا۔ یہ سارا عرصہ اس بات کا مظہر رہا ہے کہ سیاسی قیادت اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ عوام کی مختلف پرتوں نے پوری قوت سے مزاحمت کی گئی۔ طلبا، مزدور، کسان، صحافی، بزنس کمیونٹی، دانشوروں غرضیکہ ہر فورم پر ریاستی اسٹیبلشمنٹ کو چیلنج کیا جاتا رہا ہے۔ کیا یہ عوام اور سویلین معاشرہ کی مضبوطی اور طاقت کا مظہر نہ تھا گو کہ بڑی کامیابیاں حاصل نہ ہو سکیں، مگر یہ بھی سچ نہیں ہے کہ ساری معاشرتی انجینئرنگ ریاستی اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھ میں تھی۔

☆..... 1988ء کے بعد سے لے کر آج تک ساری محاذ آرائی اور سیاسی کشمکش بنیادی طور پر متحارب سیاسی، معاشی مفاداتی سرکلز کے مابین تضادات کے مظاہر ہیں اور ریاستی حمایت، مخالفت کو یہ مفاداتی سرکلز اقتدار کی لین دین میں استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ اس 40 سالہ سیاسی تاریخ میں سیاسی قیادت اور سیاسی تنظیمیں پختگی اور مضبوطی کی طرف گئی ہیں وہ دوسروں کے ہاتھ کھیلنے کی بجائے زیادہ چالاکی سے خود کو مضبوط بنانے کی طرف پیش رفت کر رہی ہیں۔

مشرف کی حکومت کا حال دیکھ لیں۔ آخر میں وہ مکمل طور پر تنہا ہو گئے جو ان کے ساتھ تھے وہ بھی ساتھ دیتے نظر نہیں آئے، حالانکہ ایک وقت انہیں اسٹیبلشمنٹ کی مکمل حمایت حاصل تھی مگر ان کے خلاف مزاحمت میں بھی خفیہ ہاتھ ان کے اپنے حلقہ کی قوتوں کا تھا۔ ایک واجبی سی حمایت نظر آتی ہے جو شاید ان کی حیثیت یا عہدے کی مجبوری کے باعث تھی۔

☆..... میرا بنیادی نکتہ بحث صرف یہ ہے کہ!

☆..... دور حاضر میں سارے ریاستی اور غیر ریاستی کردار، حلقے اور عناصر کسی ایک کی حمایت یا مخالفت یا کسی ایک نکاتی ایجنڈے پر یکسو نہیں ہو سکتے اور یہ کہنا کہ بے چاری سیاسی قیادت، سیاسی تنظیمیں لاچار اور مجبور ہیں درست نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو ریاستی ادارے، اسٹیبلشمنٹ اب اتنے طاقتور نہیں ہیں جتنے 3 دہائیاں پہلے تھے اور نہ ہی وہ کسی ایک طاقت کے مراکز کے تحت ہیں۔ آئینی اور قانونی فریم ورک ماضی کی بہ نسبت زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح سیاسی قیادت، منتخب حکومتیں، پارلیمنٹ اور اسمبلیاں ماضی کی نسبت بہت مضبوط ہیں۔ اسی طرح ہمارے ملک میں انتخابی عمل لاتعداد مسائل اور کمزوریوں کا حامل ہے مگر سیاسی تبدیلی کا واحد قابل عمل ذریعہ انتخابات ہیں اور اس حقیقت کو سبھی اسٹیک ہولڈرز نے تسلیم کر رکھا ہے۔ وسوسے، پراپیگنڈہ اور شور وغوغا لگا رہتا ہے کہ مداخلت ہو رہی ہے۔ کسی کو ہٹایا، کسی کو گرایا جا رہا ہے مگر عملاً حالات جوں کے توں ہیں۔ 2013ء میں برسر اقتدار آنے والے اپنی معینہ مدت مکمل کر چکے ہیں۔ اس سارے دورانیہ میں بجٹ سازی، معاشی سیاسی پالیسیاں ملکی منتخب حکومت ہی طے کرتی چلی آ رہی ہے، حالانکہ ایک چھوٹا حلقہ ہر وقت یہ تاثر دیتا چلا آ رہا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔

☆..... آیئے دیکھیں بنیادی فیصلہ جات اور پالیسی سازی کہاں ہوتی ہے۔

1- تمام ریاستی اداروں کے سربراہوں کی پوزیشنز پر افسروں اور سربراہوں کی تقرریاں منتخب وزیراعظم کی صوابدید پر ہوتی ہیں۔

2- تمام ریاستی اداروں کے قواعد وضوابط پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

3- ملکی اور صوبہ جاتی بجٹ سازی منتخب نمائندوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

4- غیر ملکی معاہدے منتخب نمائندگان کرتے ہیں۔ سی پیک ہو، آئی ایم ایف، امریکہ، ترکی، سعودی عرب سے معاہدے ہوں۔

5- ملکی معاشی پالیسیاں منتخب افراد بناتے ہیں ان کی صوابدید ہوتی ہے مگر وہ نہ تو پارلیمنٹ سے منظوری لیتے ہیں اور نہ ہی معاشی پالیسیاں بناتے، مشاورت کرتے ہیں تاہم کوئی مداخلت نہیں ہوتی۔

6- ذرائع ابلاغ، سوشل میڈیا، سبھی کچھ منتخب حکومت کے کنٹرول میں ہے۔

☆..... لاء اینڈ آرڈر بنیادی طور پر صوبوں اور وفاقی محکمہ داخلہ کے پاس ہے، تاہم بعض امور میں رینجرز اور مسلح افواج کی مدد حاصل ہوتی ہے، مگر یہ مدد بھی متعلقہ حکومت کی درخواست اور منظوری سے ہوتی ہے۔ کراچی، بلوچستان کے حالات دیکھ لیں مگر پنجاب میں صورتحال مختلف ہے۔ وہاں فری ہینڈ نہیں دیا گیا۔

☆..... خارجہ پالیسی سازی اصولاً پارلیمنٹ کے ذریعہ ہونا چاہئے، مگر خود منتخب حکومت نہیں چاہتی، تاہم جب کبھی بھی ایسا چاہا گیا تو عملاً ہوا ہے۔ ہماری خارجہ پالیسی کے بنیادی نکات کیا ہیں۔ جن پر تمام ریاستی عناصر کا اتفاق رائے ہے، تاہم سول سوسائٹی اور عوام الناس میں تقسیم رائے ہے، چونکہ یہ مسائل، ایشوز کبھی پارلیمنٹ میں زیر بحث نہیں آتے تو مجموعی پالیسی بارے عمومی طور پر واقفیت کم ہوتی ہے۔ ان ایشوز پر کنفیوژن اور ایک سے زائد رائے موجود ہونے کے باعث ریاستی پالیسی واضح نہیں ہوتی۔

☆..... مثال کے طور پر ہمیں معلوم نہیں کہ اب کشمیر پالیسی کیا ہے۔ کیا ہم الحاق پاکستان کے لئے کوشاں ہیں۔ کیا ہم کشمیریوں کی تحریک آزادی یا ان کے آزاد تشخص کے حامی ہیں۔ بھارت سے ہمارے تعلقات کی بنیاد کیا ہونا چاہئے؟ کیا بھارت میں اقلیتوں اور مسلمانوں کے خلاف انتہا پسندی پر ہمیں خاموش رہنا ہوگا۔ بھارت کی طرف سے ہمارے خلاف عالمی سطح کے پروپیگنڈہ کے بارے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ کیا بھارت سے باہمی تجارت اور سیاسی تعلق داری ایک ہی بات ہے؟ کیا افغانستان، ایران، سعودی عرب، چائنہ، روس، امریکہ، یورپ کے حوالہ سے ہمارے سبھی اسٹیک ہولڈرز متفق ہیں۔ چرچا کیا جاتا ہے کہ منتخب حکومت خارجہ پالیسی سازی میں آزاد نہیں ہے۔ میرے خیال میں آزاد ہونا تو تبھی طے ہوگا کہ جب منتخب حکومت کی اپنی کوئی خارجہ پالیسی ہو جو پارلیمنٹ بحث ومباحثہ کے بعد ترتیب دے اور پھر رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ یہاں تو کوئی پالیسی ہی نظر نہیں آتی۔

اس ساری بحث کے بعد صورت حال یہ ہے کہ ہماری سیاسی لیڈرشپ اور سیاسی جماعتوں کی استعداد کار کا سوال ہے جس کی وجہ سے مناسب فورم بنیادی پالیسی سازی پر کامیاب نہیں ہو پاتے۔

☆..... اب دنیا بھر کے ممالک میں عوام، ریاست، منتخب ادارے سبھی اپنے ملک میں برابری کے اسٹیک ہولڈرز ہوتے ہیں اور ان کے مفادات میں یکسانیت بھی ہوتی ہے اور ٹکراؤ بھی ہوتا ہے، تاہم مہذب ممالک میں جمہوری طور پر منتخب فورم سبھی سٹیک ہولڈرز کے مفادات کا تحفظ بھی کرتے ہیں اور ان کے مفاداتی ٹکراؤ کی مینجمنٹ بھی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسی کا فقدان ہے۔ بالادستی کی لڑائی سے بحران ہوتے ہیں، جبکہ مینجمنٹ سے حل نکالے جاتے ہیں۔

☆..... آخر میں آیئے دیکھیں۔ حالیہ سیاسی کشمکش اور اس کے بنیادی نتائج متحارب مفاداتی سرکلز اور سیاسی قوتوں کے مابین اقتدار کی خاطر جدوجہد جمہوری حق گردانا جاتا ہے، تاہم اس حق کے استعمال میں سازش اور ماورائے آئین طور طریقے نہیں ہونے چاہئیں۔ البتہ جوڑ توڑ، پراپیگنڈہ، دشنام طرازی، مخالفانہ بیان بازی، دھرنے، جلسہ جلوس، ہڑتالیں سبھی طریقوں اور انداز کو دنیا بھر کی جمہوری سیاست کا حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہاں البتہ مسلح شورش، خون خرابے کے ذریعے برسر اقتدار آنا یا کسی غیر آئینی راہ سے اقتدار پر قبضہ آج کی مہذب دنیا میں پسند نہیں کیا جاتا۔

☆..... ہمارے ملک میں یہ سب کچھ ہے مگر مذہبی دہشت گردی کو چھوڑ کر باقی سب 2018ء کے انتخابات کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ موجودہ حکومت اپنا دورانیہ مکمل کرے گی، عبوری حکومت آئے گی، نئے انتخابات ہوں گے، نئے جوڑ توڑ، نئی صف بندیاں ہوں گی مگر ہر کسی کو ووٹ لینے ہوں گے۔ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے اور نہ کوئی دوسری راہ اختیار کر سکے گا۔ البتہ سیاسی مخالفت میں انتہائی بیان بازی اور زبان کی سختی کی بدولت اگر کوئی امن وامان کی خرابی اور تباہی برآمد ہوتی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سارا عمل گڑبڑا جائے۔

☆..... اب آیئے حالیہ سیاسی بحران پر نظر ڈالیں

☆..... موجودہ حکومت کے خلاف اپوزیشن کا ایک حصہ شروع دن سے ہی دھاندلی، کرپشن اور قومی ذرائع کی لوٹ کھسوٹ کے الزامات لگا رہا ہے۔ جس پر کئی طرح کا شور وغوغا اور احتجاج نظر آئے ہیں۔ پانامہ لیکس کے حوالہ سے ایک عالمی سطح کا سکینڈل گزشتہ سال سامنے آیا جس کی زد میں دنیا بھر سے مختلف سیاسی شخصیات، حکومتی افراد اور نمایاں شہری آ گئے۔ اس سکینڈل میں صرف اتنا تھا کہ پانامہ میں ٹیکس ریلیف کی سہولیات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دنیا بھر میں متمول افراد کمپنیاں بناتے ہیں جو آف شور کمپنیاں کہلاتی ہیں اور اپنی دولت جو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں وہ پانامہ میں ان کمپنیوں میں لگا دیتے ہیں اور پھر یہ کمپنیاں دنیا کے دیگر ممالک میں کاروبار، خرید وفروخت، مالیاتی ٹرانزیکشن میں ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ان کمپنیوں کے مالکان اور ان کے اثاثہ جات میں نواز شریف کے اہلخانہ اور ان کی لندن کی جائیداد آ گئی جس پر یہ سارا شور مچ گیا۔ اپوزیشن کے شور مچانے پر نواز شریف کی بوکھلاہٹ کہ وہ دوڑے گئے اور اسمبلی کے فلور پر صفائی پیش کر دی۔ اسمبلی میں وہ زیادہ جاتے نہیں تھے مگر وہاں انہوں نے کاغذات لہرا لہرا کر اپنی لندن جائیداد کی ملکیت تسلیم کر لی اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ جدہ کی جائیداد بیچ کر خریدی گئیں۔ اب سوال اٹھ گئے کہ کب خریدی گئیں، کیونکہ کئی وزراء اور رفقا کہہ چکے تھے کہ وہ 93ء میں خریدی گئے جدہ کی فیکٹری کا قصہ بعد میں تھا۔ ملک کا سربراہ ہو اور بیانات میں تضاد آ جائے اور اپوزیشن کا شور وغوغا ہو، لہٰذا یہ سارا پنڈورا بکس کھل گیا۔ اب سوال ہے کہ کیا یہ عالمی سازش تھی یا پاکستان کے اندر کوئی سازش تھی۔ یہ پنڈورا بکس کھلا مگر اس سوال کا جواب کیا ہونا چاہئے۔ بالکل وہی جو سابقہ وزیراعظم نے اسمبلی میں کہا وہ درست کہا مگر پھر اس پر قائم نہ رہے جب عدالت میں مقدمہ چلا تو دوسرا موقف آ گیا اور کہا کہ اسمبلی میں جو کہا وہ کہا سچ تھا کہ..... اور پھر ایک تیسرا موقف آ گیا۔ قطری شہزادے کا خط آ گیا، پھر متحدہ امارات کی ملز کا ذکر آ گیا تو بات بگڑتی گئی۔ بہرحال عدالتی فیصلے کے نتیجے میں بننے والی مشترکہ تحقیقاتی ٹیم کی تحقیقات میں نئے ایشوز سامنے آ گئے۔ اقامہ نکل آیا جس کا سارے فسانہ میں ذکر نہ تھا مگر چونکہ نیا قابل اعتراض ایشو سامنے آ گیا تھا، لہٰذا یہ بری طرح پھنس گئے۔ صادق اور امین نہ ٹھہرتے تو نااہلی تو بنتی تھی۔ اس سارے قصے میں ناانصافی، انتقام یا سازش کہاں ہے۔ آرٹیکل 62-63 کا اطلاق غلط ہوا؟ انہوں نے اقامہ کا ذکر کیوں نہیں کیا ..... کیا وزیراعظم کا کسی دوسرے ملک کا Valid اقامہ رکھنا درست ہے کہ نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے مگر اگر اقامہ ہے تو ازخود بے نقاب کیا جائے۔ یہ آئینی شرط ہے، اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ نااہلی کی تشریح کے ضمن میں ہے۔ اصلی سوال تو اب باقی ہے کہ لندن کی جائیداد کس کی ملکیت ہے، کیسے خریدی گئی اور رقم کی ترسیل کیسے اور کہاں سے کی گئی۔ اس سوال کا جواب تو دینا ہوگا۔ بصورت دیگر سیاسی بحران چلتا

رہے گا بلکہ روز بروز مشکلات بڑھتی گئیں۔ اس ساری کیفیت میں ریاست کے سبھی سٹیک ہولڈرز اپنا اپنا مفاد مدنظر رکھتے ہوئے کوئی نہ کوئی کردار ادا کرتے ہیں۔ مفاداتی بنا پر جاری گورننس میں یہ قدرتی اور منطقی بات ہے۔ چند باتیں طے شدہ ہیں۔

1- آج کے دور میں انتخابات ہی تبدیلیٔ اقتدار کا ذریعہ ہیں۔ انتخابی عمل میں دھاندلی، گڑ بڑ، ووٹوں کی خرید وفروخت اور سرکاری وسائل کا ناجائز استعمال، تشدد، ڈرانا دھمکانا سبھی کچھ ہوسکتا ہے مگر انتخابی عمل کے برعکس کسی دوسرے طریقے سے سیاسی تبدیلی نہیں آئے گی۔

2- سبھی مفاداتی گروہ اور حلقے اپنے اپنے سیاسی اظہار، تنظیموں کے ذریعے اس انتخابی عمل کا حصہ بنیں گے جو نہیں بنیں گے وہ فرسٹریشن کا شکار ہوں گے۔

3- سیاسی قیادت، سیاسی جماعتیں، ذرائع ابلاغ، سول سوسائٹی ادارے ماضی کی بہ نسبت زیادہ تجربہ کار، زیادہ منظم اور زیادہ طاقتور ہیں۔

4- ملک کی مجموعی سیاسی فضا میں گھٹن نہیں ہے، ہر کوئی اپنی بات، اپنی استطاعت کے مطابق کھل کر بیان کرسکتا ہے۔ سوشل میڈیا بھی خاصا متحرک ہے۔

5- سیاست میں حکمرانی میں کرپشن کی سطح بہت بلند ہے۔ انتخابی عمل میں انویسٹرز آچکے ہیں جو اپنے اپنے پسندیدہ مہروں پر سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ لامحالہ کامیابی کے بعد حاصلات کی شکلیں بھی ڈھونڈتے ہیں۔

6- ساری سیاسی جماعتوں میں نظریاتی قیادت اور کارکن نظرانداز کئے گئے ہیں یا ہورہے ہیں؟

7- سیاست میں پروگرام، منشور، انتخابی وعدے، نعرے غائب ہوگئے ہیں۔ محض برا بھلا کہنا اور ایسی باتیں کرنا جو منفی پراپیگنڈے پر منحصر ہیں عام ہوگئی ہیں۔

8- مذہبی بنیاد پرستوں اور انتہا پسندوں کا عمومی ووٹ بینک زوال پذیر ہے۔ گوکہ انہوں نے اپنی شناخت منوائی ہے، مگر ووٹ بینک محدود ہوتا جارہا ہے۔

9- سیاسی میدان میں تشدد کے امکانات بڑھ رہے ہیں۔

10- کسی بھی پارٹی کے پاس مضبوط تنظیمی ڈھانچہ نہیں ہے، بلکہ زیادہ پسندیدہ طریق کار بڑے بڑے جلسے، ٹیلی ویژن پروگراموں کے ذریعے عوام کو مخاطب ہونا معمول بن گیا ہے۔

11- محدود سطح پر موجود بائیں بازو کی روایتی پارٹیاں اپنی الگ شناخت کھو رہی ہیں، بلکہ بڑی جماعتوں کی صف بندی کا حصہ بن رہی ہیں۔

☆..... ان حالات میں چند ایک بنیادی ایشوز ہیں۔ جن پر اصولی موقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

1- کیا حکمرانی کے ذریعے کرپشن کو فروغ دیا جاتا ہے اور کیا کرپشن ایک ایشو ہے؟

2- کیا انتخابی سیاست کسی پروگرام کے گرد گھومتی ہے یا (Electables) کے گرد جن کا کوئی سیاسی ایجنڈا نہیں ہے؟

3- کیا ریاست کے اندر بھی مفاداتی گروہ اور مخصوص سیاسی پولرائزیشن موجود ہے یا نہیں ہے؟

4- کیا انتخابی عمل میں سبھی اسٹیک ہولڈرز کسی سیاسی پروگرام کے ساتھ حصہ لیں؟

5- کیا سیاسی عمل میں جوڑ توڑ اور سیاسی پوزیشنیں بدل لینا نارمل بات ہے؟

میرا تعلق کسی سیاسی گروہ، سیاسی رجحان، سیاسی نظریہ کے ساتھ نہیں ہے میں صرف ملکی آئین، قانون اور عالمی بہترین مثالوں کی روشنی میں سوچنا اور عمل کرنا چاہتا ہوں میرے خیال میں شخصی آمریت اور مشاورت نہ کرنا اور اقتدار میں رہتے ہوئے مالیاتی اور سیاسی ذاتی فوائد حاصل کرنا اصولی طور پر غلط ہے۔ اس سارے کھیل کی نگرانی اور احتساب ہونا چاہئے، تاہم قانون ایسا ہو جس کے ذریعے انتقامی کارروائی نہ ہوسکے۔

☆..... پاکستان کے حکمرانی کے مسائل میں سرفہرست درج ذیل ہیں۔

1- وفاقی جمہوری ریاست کے طور پر استحکام:

☆..... یعنی صحیح معنوں میں وفاقیت اور جمہوریت مستحکم ہو۔ اختیارات کی نیچے منتقلی ہو۔ وفاقی اور صوبائی تعلق آئین بالخصوص 18 ویں ترمیم کے بعد متعین کردہ شکلوں میں موجود بھی ہو اور اس پر عملدرآمد بھی ہورہا ہو۔ حکومت باقاعدگی سے نئے آزادانہ ووٹوں کے ذریعے منتخب ہو۔ بااختیار ہو یا پارلیمنٹ کی بالادستی ہو اور حکومت پارلیمنٹ کو جوابدہ ہو۔

2- گورنینس میں شفافیت اور احتساب کا نظام موجود ہو:

☆..... چونکہ گورنینس میں خاصی گنجائش ہوتی ہے کہ اختیارات اور اتھارٹی کا غلط استعمال ہوسکے۔ اقربا پروری، جانبداری، میرٹ کو نظرانداز کرنا،

کرپشن، مطلق العنانیت اداروں کو غیر مستحکم کرنا ایسے امکانات ہیں جو گورننس میں بااختیار سرکلز کے دائرہ عمل میں ہوتے ہیں۔ اس لئے شفافیت اور اکاؤنٹیبلیٹی کا کوئی غیر جانبدارانہ، منصفانہ نظام کی موجودگی اور آزادانہ فنکشنگ جمہوری وفاقیت کی لازمی شرط ہے۔

3- عوام کی فلاح و بہبود کو فوکس کرنا:

☆..... ہمارا تیسرا بڑا مسئلہ عوامی فلاح و بہبود میں ترجیحات کا غلط یا بالکل تعین نہ ہونا ہے۔ صوبائی اسمبلیاں اور پارلیمنٹ اولین فورم ہے جہاں ان ترجیحات پر بحث و مباحثہ کے بعد تعین لازمی ہے، مگر اسمبلیوں کے بین عوامی تنظیمیں، پروفیشنل تنظیمیں اور سول سوسائٹی کے دوسرے ادارے ہیں جن کی مشاورت اور تجاویز سے ان ترجیحات کا تعین زیادہ بہتر ہوسکتا ہے۔

4- بنیادی انسانی حقوق کا احترام اور قانون کی حکمرانی:

☆..... یہ چوتھا بڑا مسئلہ ہے کہ تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں اور ہر قسم کے تعصب اور امتیازی سلوک کا خاتمہ ریاست کی ذمہ داری ہو۔ اسی طرح قانون کی حکمرانی کو مستحکم کیا جائے تمام شہری قانون کی نظر میں برابر سلوک کے مستحق ہوں ہر قسم کے امتیازی اور ناانصافی پر مبنی قوانین کو ختم کیا جائے۔

5- اختیارات کی ڈی سنٹرلائزیشن اور نیچے منتقلی:

☆..... ہمارے ہاں مطلق العنانیت اور آمرانہ ذہنیت اس لئے پیدا ہو جاتی ہے کہ حکمرانی کی ہر سطح اور ہر شکل میں اختیارات کا ارتکاز موجود ہوتا ہے یا گنجائش ہوتی ہے کہ اختیارات کسی ایک فرد یا ادارے میں مرتکز ہو جائیں اس کے یکسر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، لہٰذا ضروری ترامیم کے ذریعے ممکن بنایا جائے کہ اختیارات کا ارتکاز بھی روکا جائے اور اختیارات کو نیچے منتقل بھی کیا جائے۔

6- مقامی حکومتوں کا استحکام:

☆..... دنیا بھر کی جمہوریتوں میں بعض مائیکرو سطح کی ترقیاتی منصوبہ بندی اور ذمہ داریاں مقامی حکومتوں کے ذریعہ سرانجام دی جاتی ہیں اور مقامی حکومتیں مقامی شہریوں کے منتخب نمائندوں میں مشتمل ہوتی ہیں اور بااختیار بھی ہوتی ہیں۔ ہم انہیں غیر اہم سمجھتے ہیں اور نظرانداز کرتے ہیں اگر کبھی مقامی حکومتیں تشکیل دیتے ہیں تو انہیں بے اختیار اور غیر مؤثر بنانے کی کوششیں کرتے ہیں اس پریکٹس کو بدل دینا چاہئے۔

7- آبادی کے نظرانداز کئے گئے حصوں، خواتین، سینئر سٹیزن:

☆..... مذہبی اقلتوں، محنت کش عوام، معذور اور خصوصی آبادی کے لئے اثباتی اقدامات پر مبنی خصوصی پالیسیاں وضع کرنا ضروری ہیں، تاکہ وہ بھی مین سٹریم زندگی میں برابر کی حیثیت سے شریک ہوسکیں۔

8- معاشرے کو کثرت النوع تسلیم کرتے ہوئے:

☆..... اقلیت اور اختلاف رائے کو برداشت اور احترام کی اقدار میں تولنا اور تسلیم کرنا۔ تحمل، بردباری، رواداری اور سماجی ہم آہنگی پر مبنی تہذیب و تمدن کا فروغ اور ریاست کو غیر نظریاتی غیر جانبداری کی طرف لے کر جانا، ہماری زندگی کا اہم فریضہ ہے اس کے لئے خصوصی منصوبہ بندی لازمی ہے۔

سیاسی جماعتوں کو صحیح جمہوری اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بنانا:

☆..... دور حاضر کی حکمرانی، وفاقیت اور جمہوریت کا استحکام سیاسی جماعتوں کی آزادانہ نشوونما، آزادانہ اور جمہوری بنیادوں پر فنکشنگ سے مشروط ہے۔ اس کے لئے ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ غیر جانبداری سے سب سیاسی جماعتوں اور فریقین کو لیول فیلڈ مہیا کرے، مگر سارے سیاسی عناصر، جماعتوں اور افراد کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی فنکشنگ میں جمہوریت، رواداری، سب کو ساتھ ملانے والا کلچر اپنائیں۔ وہ سارے عوام کے مفادات کا تحفظ نہیں کرسکتیں، کیونکہ ہر سیاسی جماعت کسی خاص طبقے یا افرادی گروپوں کے مفادات کی ترجمانی کرے گی تو کوئی ناراض بھی ہوں گے، مگر ضروری ہے کہ جن کی نمائندگی یا ترجمانی کا دعویٰ کریں۔ وہ اس کی کارکردگی کا اہم جزو ہوں۔ ادارے موجود ہوں اور ادارے کام کر رہے ہوں' کارکنوں کے حقوق واضح ہوں اور کارکنوں کی تعلیم و تربیت کا مناسب استعمال ہو۔

10- ہماری ریاست کی داخلہ، خارجہ، دفاع، تعلیم، صحت، عوامی ویلفیئر اور دیگر ترقیاتی ایشوز بارے واضح پالیسیاں ہوں اور ان پالیسیوں کی روشنی میں ادارے فعال بھی ہوں اور مستعدی سے ان پر عملدرآمد یقینی بنائیں۔

☆..... یہ سارے ایشوز اور مسائل پر عمومی طور پر اتفاق کرلیا جاتا ہے مگر عملاً کوئی ٹھوس پیش رفت نظر نہیں آتی یہ گورننس میں ہمارا عمومی رجحان ہے جس پر ہر جگہ رسمی اور غیر رسمی فورم پر نشاندہی بھی ہوتی ہے، مگر عمل میں نظرانداز کردیئے جاتے ہیں۔ جس سے صورتحال ابتر ہوتی جارہی ہے اگر آپ متفق ہوں تو پھر آپ کے طرز عمل میں اس کا اظہار بھی ہونا چاہئے۔☆☆

مارکسی نظریہ داں۔ ڈاکٹر حسان

۱۹۲۱ء۔۱۹۸۵ء

تحریر: مسلم شمیم

شبِ سیہ کا مسافر، وہ صبحِ نو کا سفیر
وہ سنگِ میل نہیں تھا، نشانِ منزل تھا

خالد علیگ کا شعر ڈاکٹر حسان کی پوری زندگی کا عکس و آئینہ اور ایک ایسا خراجِ عقیدت ہے جس کا وہ واقعی استحقاق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ساری زندگی مارکسی فلسفے کی تفہیم کے ساتھ اُس کی عملی تفسیر پیش کرنے میں بسر کی۔ اِس فکر کی ترویج و اشاعت کے لیے اُنھوں نے جدوجہد کا راستہ اپنایا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں اُنھوں نے انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی جانشیں تنظیم عوامی ادبی انجمن کے بانی سکریٹری جنرل کی حیثیت سے تادمِ آخر یعنی ۱۹۸۵ء تک اُس کو فعال رکھا۔ ڈاکٹر حسان نے عوامی ادبی انجمن کے تاسیسی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''آج کے معاشی، سیاسی اور سماجی پس منظر میں ترقی پسند ادیبوں اور دانش وروں کا فریضہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اُنھیں ایک طرف حکمراں طبقات کی آئیڈیالوجی سے لڑنا ہے اور دوسری طرف ترقی پسندی کو اپنے متوسط طبقے کے مفادات کی بھینٹ چڑھانے والے ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کی بزدلی اور موقع پرستی کو بھی بے نقاب کرنا ہے، کیونکہ آج دنیا دو واضح نظریاتی اور سماجی حلقوں میں بٹ چکی ہے۔ پھر سیاست کی طرح ادب میں بھی کوئی غیر جانب دار رہنے کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے؟ اس لیے آج کے ترقی پسند ادیبوں اور دانش وروں کا کام یہ ہے کہ وہ اشتراکی حقیقت نگاری کے نظریے سے لیس ہوکر اپنے ادب اور آرٹ کو بہتر سماج کی تخلیق اور تعمیر کے لیے استعمال کریں''۔

ڈاکٹر حسان کی سوچ اور فکر کھلی کتاب کے مانند تھی۔ وہ ایک بے باک اور نڈر دانش ور تھے اور جرأتِ انکار اُن کی سرشت اور فکر و نظر میں شامل تھی۔ انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال سے پاک ایک حسین سماج کی تشکیل اور حکمراں طبقوں کی بالادستی کے خاتمے کے لیے ڈاکٹر حسان نے عملی جدوجہد کی، اور اُن کی پوری زندگی اِسی جدوجہد سے عبارت تھی۔ اِس جدوجہد کی پاداش میں اُنھیں قید و بند کی صعوبتوں سے بارہا گزرنا پڑا۔ وہ بصد خشوع و خضوع اپنے آدرش کو آگے بڑھانے میں سرگرمِ عمل رہے اور اُنھوں نے اپنے مارکسی علم سے ملک کی عوامی تحریکوں کو گم راہی اور موقع پرستی سے بچانے کی تگ و دو جاری رکھی۔ وہ ملک کے اُن معدودے چند مارکسی دانشوروں میں تھے جو نہ صرف مارکسی فلسفے کا ادراک رکھتے تھے بلکہ اِس نظریے کی روشنی میں اپنے سماج کے طبقاتی مسائل اور مفادات کو بھی سمجھتے تھے اور سماج کی طبقاتی بنیادوں کی بیخ کنی کے لیے انقلاب کے پرچارک تھے۔ ڈاکٹر حسان کی زندگی کا محور انسانیت کے لیے تاب ناک مستقبل، انقلاب و آزادی اور ملک کے مظلوم اور کچلے ہوئے عوام کی طبقاتی سیاست تھا۔ مرحوم نے عملی اور شعوری طور پر استحصال زدہ طبقات کی سیاست کو اپنا آدرش بنالیا تھا۔ وہ ساری عمر اِسی آدرش کے لیے سرگرداں رہے اور اپنے اِس آدرش یعنی اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کے متمنی بھی تھے اور سرگرمِ کار بھی۔

ڈاکٹر حسان کا آبائی تعلق دکن سے تھا اور وہ گاؤمٹ پلی، ضلع میدک، حیدر آباد دکن میں ۱۹ر مارچ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر حسان گویا کامریڈ حسن ناصر اور مخدوم محی الدین کے ہم وطن ہونے کا فخر رکھتے تھے۔ اُن کی تعلیمی زندگی کا بیش تر حصہ حیدر آباد دکن میں گزرا۔ اُنھوں نے ۱۹۳۹ء میں ضلع محبوب نگر حیدر آباد سے میٹرک کی سند حاصل کی اور ۱۹۴۶ء میں اُنھیں جامعۂ عثمانیہ سے سیاسیات میں ایم۔ اے کی ڈگری تفویض ہوئی وہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء تک لندن یونیورسٹی سے وابستہ رہے اور وہاں سے سیاسیات میں پی ایچ۔ ڈی کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ کراچی سندھ منتقل ہوگئے اور یہیں کے ہو رہے۔ شعبۂ تدریس سے اُن کی وابستگی کا آغاز ۱۹۴۶ء میں جامعۂ عثمانیہ کے حیدر آباد دکن کے شعبۂ سیاسیات میں سینئر لکچرر سے ہوا اور وہ جامعۂ عثمانیہ سے ۱۹۵۲ء تک وابستہ رہے۔ ۱۹۵۲ء میں نقلِ مکانی کے بعد وہ کراچی میں اردو کالج کے شعبۂ سیاسیات میں لکچرر مقرر ہوئے اور اردو کالج کراچی میں ۱۹۵۷ء تک اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ اِس دورانیے میں وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے اعزازی لکچرر رہے۔ ۱۹۶۴ء میں وہ حاجی عبداللہ ہارون کالج لیاری کے صدرِ شعبۂ سیاسیات اور وائس پرنسپل کے منصب پر فائز رہے اور بعد میں مذکورہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں وہ وفاقی گورنمنٹ اردو آرٹس کالج کے شعبۂ سیاسیات کے صدر کی حیثیت سے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے اور ۱۹۸۱ء میں وہیں سے سبک دوش ہوئے۔ ۲۷ر فروری ۱۹۸۵ء کو کراچی میں اُن کا انتقال ہوا اور سخی حسن قبرستان کراچی میں وہ دفن ہوئے۔ یہ اُن کی زندگی کے کوائف کا اجمالی

آئینہ ہے۔

ڈاکٹر حسان کا انتقال ترقی پسند حلقوں اور بائیں بازو کی تنظیموں اور جماعتوں کے لیے ایک بڑا تاریخی سانحہ تھا اور اُن کی وفات سے شہرِ کراچی خصوصی طور پر اور پاکستانی معاشرہ عمومی طور پر غریب تر نظر آنے لگا، چنانچہ اُن کی وفات کے تین ہفتے بعد ملک کی بیس اہم ترین مزدور تنظیموں اور ادبی اداروں کی طرف سے ایک مشترکہ ریفرنس منعقد ہوا جس میں شہر کے معتبر شاعروں، دانش وروں اور ورکرز یونین کے رہ نماؤں نے خطاب کیا اور مرحوم کو اُن کے کارناموں اور سماج کے لیے اُن کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اِس اجتماع میں ایک جامع قرارداد تعزیت بھی پیش کی گئی۔ یہ تعزیتی قرارداد اِس مشترکہ تعزیتی جلسے میں شریک بیس تنظیموں کے رہنماؤں کے ایما پر بابر ایاز نے لکھی اور جلسے کے ناظم موجودہ عوامی ورکرز پارٹی کے جنرل سکریٹری اختر حُسین نے پڑھی۔ مذکورہ قرارداد کے ابتدائی حصے کا متن آج بھی معنویت کا حامل ہے، اور تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر وہ اقتباس نذرِ قارئین ہے:

''بروز بدھ، بتاریخ ۲۷ر فروری ۱۹۸۵ء کی صبح مشہور مارکسی دانش وراور انقلابی رہ نما ڈاکٹر م۔ر۔حسان دل کی دھڑکن بند ہونے کے سبب ہم سب سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اُن کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے مزدوروں، طلبا، خواتین، ادیبوں اور سیاسی کارکنوں کی جانب سے منعقد کیا جانے والا یہ جلسہ اُن کی بے وقت موت پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور اِس امر کا اظہار کرتا ہے کہ اُن کی ناگہانی موت ملک کی ترقی پسند قوتوں کے لیے ایک عظیم نقصان ہے۔

ڈاکٹر حسان ملکی اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں واضح مارکسی نقطۂ نظر رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جو مارکسسٹ عملاً غربت، بھوک بیماری، بے روزگاری، جہالت اور ظلم کے چنگل میں جکڑے ہوئے عوام کو ملک کے مٹھی بھر استحصالی طبقوں سے آزادی دلانے کے لیے جدوجہد نہیں کرتا، وہ یا تو اِس فلسفے کو سمجھتا ہی نہیں یا اپنے شعور کا فرض ادا کرنے سے گریز کرتا ہے، اسی لیے وہ طبقاتی تنظیموں کے قیام کو ضروری سمجھتے تھے اور شب و روز اُن کو منظم کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک سے ہر قسم کے طبقاتی اور قومی جبر واستحصال کا خاتمہ ہو جائے اور لوگ آزادانہ فضا میں سکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

ڈاکٹر حسان ایک سچے انقلابی کی حیثیت سے جیے اور اپنا مقام پیدا کیا۔ مارکسی فلسفے پر پختہ ایمان نے اُن کو ایک جری، بے لاگ اور غیر مصلحت پسند بنا دیا تھا۔ کالج میں سیاسیات پڑھانے سے لے کر ادبی اور سیاسی محفلوں تک اُنھوں نے مزدور طبقے کے مفاد کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔ مارکسی فلسفے نے اُنھیں ابہام پرستی اور قوم پرستانہ تنگ نظری سے پاک رکھا۔

ڈاکٹر م۔ر۔حسان غیر فرقہ وارانہ، سائنسی اور عقلی بنیادوں پر ایک غیر طبقاتی سماج کے قیام کے لیے آخری دم تک جدوجہد کرتے رہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عرش پر جنت کی تلاش سے بہتر یہ ہے کہ زمین ہی کو جنت بنایا جائے۔ اِس آدرش کے حصول کے لیے اُنھیں جیل سمیت مختلف مشکل مرحلوں سے بھی گزرنا پڑا اور اُنھوں نے ہر مشکل کا بڑی پامردی اور خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔

ڈاکٹر حسان کی سوچ اور عمل نے مختلف طبقوں کے بہت سے افراد کو متاثر کیا اور وہ لوگ بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ استحصال سے پاک سماج کے قیام کی جدوجہد میں دل و جان سے شریک ہو گئے۔ مزدوروں کو طبقاتی شعور سے مسلح کر کے اُن کو منظم کرنا ہو یا کسانوں کی کانفرنس کے لیے چندہ جمع کرنا، ادیبوں اور دانش وروں کو ترقی پسند سوچ کی بنیاد پر منظم کرنا ہو یا طلبا اور خواتین کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے صحیح راستہ دکھانا یا مظلوم قومیتوں کے حقوق کا مسئلہ، ڈاکٹر صاحب ایک باعمل مارکسی کی طرح ہر وقت مصروفِ جدوجہد نظر آتے تھے''۔

ڈاکٹر حسان بائیں بازو کے حلقوں میں ملکی سطح پر جانی پہچانی والی ایک ایسی شخصیت تھے جس کے لیے دلوں میں بڑی عزت و توقیر تھی اور اُن کے گہرے مراسم اور رابطے تھے خصوصیت کے ساتھ جناب فیض احمد فیض کے ساتھ اُن کی قربت کی نوعیت غیر معمولی تھی۔ وہ عبداللہ ہارون کالج لیاری کراچی میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے اُن کے معتمدِ خاص اور رفیقِ کار تھے اور اِن دونوں کے درمیان قربتوں کے رشتوں کی اساس مارکسی نظریے اور آدرشوں پر استوار تھی:

وہ تو وہ ہیں، تمھیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو
(فیض)

فیض صاحب کے محبوب نظر سے ڈاکٹر حسان کو بھی وہی والہانہ عشق اور محبت تھی جس سے جناب فیض کی شاعری کسبِ نور کر کے دلوں کو گرماتی اور ذہنوں کو منور کرتی رہی جناب فیض کا محبوبِ نظر اُن کا آدرش ہے۔ یہ آدرش اپنے وطن کے گلی کوچوں سے نکل کر پوری دھرتی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جس آدرش نے وطن دوستی اور انسانیت دوستی کے دو دھاروں کو ایک کر کے آفاقیت کے ایک

سیلِ رواں کو جنم دیا ہے یہ آدرش انسانیت سے بے پناہ پیار کا آدرش ہے، مظلوم طبقات کے CAUSE کی حمایت کا آدرش ہے، یہ آدرش آزادی، خوش حالی اور حقیقی بھائی چارگی کی منزل کے حصول کے لیے جدوجہد کا آدرش ہے۔

ڈاکٹر حسان کی فکر و دانش بنی نوعِ انسان سے اُن کی والہانہ چاہت اور مظلوم طبقات کے CAUSE سے محبت اور COMMITMENT سے عبارت ہے۔ وہ ایک نظریاتی انسان کی حیثیت سے ساری زندگی جدوجہد میں مصروف رہے۔ اُن کا نظریۂ حیات معاشرے کو ظلم و ستم، جبر و استحصال، غربت و افلاس، جہل و توہمات اور انگنت سماجی ناانصافیوں کی پیدا کردہ بدصورتیوں سے پاک کر کے ایک معاشرے کی تعمیرِ نو اور تشکیل و تخلیق ہے جہاں حُسن اور محبت کی حکمرانی ہو، جہاں انسان عدمِ تحفظ کے احساس سے بے نیاز ہو، جہاں منافقت، بے ضمیری اور نفرتوں کی جگہ سچائی اور خلوص کی عمل داری ہو، جہاں جہل کا پرچم سرنگوں اور علم و حکمت کا علم بلند ہو، جہاں تاریکی و ظلمت کی طاقتیں ذلیل و رسوا ہوں اور نور و نکہت سرخ رو و سرفراز ہو۔ وہ معاشرے کو ایک ایسے انقلاب سے ہم کنار دیکھنے کے خواہاں تھے جو معاشرے کے تہذیبی ورثے کو شرفِ انسانیت سے مالا مال کر دے اور اُس کی بنیادوں کو لوٹ کھسوٹ، جھوٹ، افلاس، بے ضمیری، ریاکاری اور ہر قسم کے استحصال سے پاک کر دے، انسان کو آزادی اور خوش حالی کی طمانیت میسر ہو اور وہ اُن زنجیروں کو پاش پاش کر دے جن میں انسان صدیوں سے جکڑا ہوا ہے اور جو اُس کی بے پایاں تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ میں حائل ہیں۔ وہ انقلاب جو انسانی معاشرے میں حقیقی مساوات اور بھائی چارگی کا امین ہے، وہ انقلاب جس کی تکمیل کے بعد یہ دھرتی امن و آشتی کا ایسا گہوارہ بن جائے گی جہاں جنگ کی ہول ناکیوں کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہے گا اور انسانی تہذیب کا مستقبل ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر حسان محنت کشوں اور تمام دیگر مظلوم طبقوں کے CAUSE کے لیے عملی جدوجہد کرنے والے دانش ور اور رہ نما تھے۔ مظلوم انسانیت کا دُکھ سُکھ اُن کا دُکھ سُکھ تھا ڈاکٹر موصوف ایک بڑی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اور اُن کی جدوجہد کے مختلف پہلو اور جہات ہیں۔ اُن کے علم و فضل سے ہم جیسے بے شمار لوگوں نے روشنی حاصل کی ہے قومی اور عالمی مسائل پر اُن کا جتنا گہرا مطالعہ تھا، اِس کا دعویٰ بہت کم لوگ کر سکتے تھے ادب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر حسان کا ادب کا مطالعہ بھی کچھ کم وقیع اور گراں قدر نہ تھا۔ ادبی مسائل پر اُن کی گرفت بڑی مضبوط تھی اور اُن پر اُن کی رائے بڑی ٹھوس، واضح اور دوٹوک ہوا کرتی تھی۔ عوامی ادبی انجمن کی نشستوں میں اُن کی عالمانہ گفتگو، اُن کے ادبی شعور کی پختگی، گہرائی اور گیرائی کی مظہر ہوا کرتی تھی۔ اُن کی یہ گفتگو ادب کے ایک شیدائی کی نہیں بلکہ ادب کے ایک مستند اور بالغ النظر استاد کی گفتگو ہوا کرتی تھی۔

عوامی ادبی انجمن کا قیام اور اُس کا باقاعدگی سے سرگرمِ عمل رہنا ڈاکٹر حسان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ عوامی ادبی انجمن جو ہمارے ملک کے مخصوص حالات میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے احیا کے طور پر قائم کی گئی اور جو بجا طور پر پاکستان میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی جانشیں انجمن ہونے کا اعزاز رکھتی ہے۔ ہمارے نزدیک ڈاکٹر حسان اِس کے سب سے بڑے بانی اور روحِ رواں تھے۔ عوامی ادبی انجمن کے قیام کا اصولی فیصلہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی حصے میں لاڑکانہ کے قریب باکرانی روڈ پر واقع ایک فارم ہاؤس میں منعقدہ خفیہ اجلاس میں کیا گیا تھا جس کی صدارت جناب فیض احمد فیض نے کی تھی اور شرکائے اجلاس میں اجمل خٹک، حبیب جالب، شمشیر الحیدری، حسن حمیدی، شوکت عابدی، تاج ابڑو، کامریڈ جمال الدین بخاری ڈاکٹر حسان اور راقم تھے اور اُس اجلاس کا میزبان اور محرک بھی راقم تھا۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کو غیر قانونی قرار دیے جانے کو ایک عشرہ گزر رہا تھا، چنانچہ ۱۹۶۰ء سے انجمن کی کسی دوسرے نام سے بحالی کا خیال زیرِ غور تھا، سو اِس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں ایک ابتدائی قیام کے لیے لاڑکانہ کے ایک کالج کے سالانہ بین اللسانی مشاعرے کے موقع سے فائدہ اٹھایا گیا۔ مذکورہ مشاعرے کا ناظم راقم تھا۔ اِس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں کئی سال لگے۔ ڈاکٹر حسان آغازِ سفر سے پیش پیش رہے۔ آخرکار ۱۹۶۷ء میں یہ تنظیم 'عوامی ادبی انجمن' کے نام سے قائم ہوئی اور اس کا منشور ایک کتابچے کی صورت میں چھ زبانوں، یعنی اردو، بنگالی، بلوچی، پشتو، پنجابی اور سندھی میں ڈاکٹر حسان نے شائع کیا جس پر مذکورہ زبانوں کے حسبِ ذیل چودہ صاحبانِ قلم نے دستخط ثبت کیے:

جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، شیخ ایاز، اجمل خٹک، گل خان نصیر، فارغ بخاری، سیف الرحمان مزاری، نورالدین سرکی، جوہر میر، رضا ہمدانی، تنویر عباسی، حسن حمیدی، ڈاکٹر حسان اور مسلم شمیم۔ ۱۹۶۷ء میں عوامی ادبی انجمن کے قیام کے وقت سے زندگی کے آخری لمحے تک ڈاکٹر حسان نے اِس کو اپنی جان کی طرح عزیز رکھا، اِس کے وقار اور ساکھ پر کوئی حرف آنے نہیں دیا۔ اِس پر کیے گئے حملوں اور یلغاروں کا اُنھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور اِس کی حیثیت تسلیم کروائی۔ عوامی ادبی انجمن کے فورم سے ڈاکٹر حسان ادبی رجحانات کو صحت مند خطوط پر پروان چڑھانے کے لیے بڑی سرگرمی سے پیش پیش رہے، جدیدیت کے منفی رجحانات کی موثر انداز سے مخالفت کر کے ادب کے پودے کو اِس کے زہریلے اثرات سے محفوظ رکھنے میں رہ نمایانہ خدمات انجام دیں۔ ادب کے ترقی پسند نظریات کی پُرزور وکالت کرنے میں اُنھوں نے کبھی کسی مصلحت کوشی کو اپنے

قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ وہ ادب کے سماجی کردار کو ہمیشہ اجاگر کرتے رہے۔ ادب کو زندگی کا ترجمان اور خادم ہونے کے منصب سے ہٹانے اور روگردانی کرانے والوں کو اُنھوں نے اپنی تیز و تند تنقید کا ہدف بنایا۔ ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں کو استوار اور مستحکم تر کرنے میں وہ نوجوان ادیبوں کے لیے شجر سایہ دار بنے رہے۔ وہ کڑے سے کڑے وقت اور انتہائی ناسازگار حالات میں بھی کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوئے اور نہ اپنے مشن کو کبھی پسِ پشت ڈالا۔ اُن کی زندگی رجائیت کی روشنی سے منور تھی اور وہ یہ روشنی دوسروں میں تقسیم کر کے ایک لازوال طمانیت محسوس کرتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے لیے وہ رجائیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے۔ عوامی ادبی انجمن کا منشور چھ صفحات پر مشتمل ایک جامع دستاویز ہے۔ ادب اور ادبی نظریات کے علاوہ اس دستاویز میں ملک میں زبان کے مسئلے پر سائنسی فکر کو بروئے کار لا کر اردو کو ملک کی مشترکہ زبان یا رابطے کی زبان کا منصب دیا گیا اور دیگر زبانوں کو قومی زبان کہا گیا۔ اردو زبان کے حوالے سے یہ نقطۂ نظر ڈاکٹر حسان نے اپنے ایک مقالے بعنوان 'پاکستان میں اردو کا مسئلہ' میں تفصیل سے پیش کیا تھا۔ اِس مسئلے کو وسیع تر تناظر میں ڈاکٹر احسان نے اپنے ایک دوسرے مقالے بعنوان 'قومیت کے مسئلے پر بحث کی ضرورت' میں پیش کیا۔ مذکورہ دونوں مقالے دو کتابچوں کی صورت میں 'عوامی فکری محاذ' کے زیرِ اہتمام شائع کیے گئے۔ ''عوامی فکری محاذ'' کا ادارہ ڈاکٹر حسان کی زندگی میں اُن کی رہ نمائی میں قائم کیا گیا تھا، فصیح الدین سالار مرحوم اُس کے روحِ رواں تھے اِس ادارے کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر حسان کا انگریزی زبان میں پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ بھی کتابی صورت میں شائع کیا گیا تھا جس کا نام 'INDIAN POLITICS AND THE BRITISH' RIGHT 1914-1922 ہے جو ۲۹۰ صفحات پر مبنی ہے۔ یہ کتاب تحریکِ آزادی کے ارتقائی سفر کے مطالعے میں قارئین کے لیے گائڈ کا درجہ رکھتی ہے جو مارکسی نقطۂ نظر یعنی تاریخی مادیت کی روشنی میں تحریر کی گئی ہے۔

ڈاکٹر حسان مرحوم نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ جریدے 'عوامی آواز' کے ذریعے رجعت پرستی، آمریت اور فسطائیت کے خلاف جو آواز بلند کی تھی، اُس کی صدائے بازگشت جمہوریت پسند اور ترقی پسند حلقوں میں عرصۂ دراز تک سنی جاتی رہی۔ اِس جریدے کے ذریعے جہاں اُنھوں نے ایک طرف مقامی رجعت پرست اور جمہوریت دشمن قوتوں پر ضربِ کاری لگائی، وہیں بین الاقوامی سامراج اور جدید نوآبادیاتی نظام کے سرپرستوں اور اُن کے کاسہ لیسوں کے مکروہ چہروں کو بھی بڑی بیباکی کے ساتھ بے نقاب کیا۔ اپنے اِس منصب کے فرائض کی ادائیگی میں اُن کو قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ وہ اِن مرحلوں سے بڑی پامردی اور خندہ پیشانی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے اور سرخ رو رہے۔ اُنھوں نے جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے کسی قربانی سے گریز نہیں کیا اور ترقی پسندی، خرد افروزی اور انسان دوستی کی ترویج اور پرچار کی راہ میں حائل ہونے والی بڑی سے بڑی رکاوٹ کی پروا نہیں کی اور اپنے COMMITMENT پر پوری شدت کے ساتھ قائم رہے۔

ڈاکٹر حسان کی بے وقت اور اچانک موت ہمارے خیال میں اِس ملک میں پائی جانے والی گھٹن اور فسطائیت کی دین تھی۔ ڈاکٹر حسان جیسا فرد اپنی روشنیِ طبع کے باوصف ایک کربِ مسلسل میں مبتلا رہنے پر مجبور تھا۔ یہ کربِ مسلسل آدمی کو مرنے سے پہلے کتنی بار موت سے پنجہ آزمائی کے مرحلے سے دوچار کرتا ہے، اِس کا اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر م۔ ر۔ حسان کی موت ترقی پسند حلقوں کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے، مگر اُن کی جسمانی موت اُن کی فکر، اُن کے نظریے اُن کی تحریک اور اُن کے کارناموں کی جلو میں ایک نئی زندگی کا روپ دھار لے گی:

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو ! پندگرو ! راہ گزر تو دیکھو
(فیض)

ڈاکٹر حسان جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، وہ ایک ایسے دانش ور اور نظریہ داں تھے جنھوں نے اپنے نظریے اور آدرش کی کارفرمائی کا عملی روپ دیکھنے کے لیے جدوجہد میں ساری زندگی بسر کی، کیونکہ وہ کارل مارکس کے اِس قول اور رائے کی قدر و قیمت اور سچائی سے آگاہ تھے کہ فلسفی دنیا کی تشریح کرتے ہیں جبکہ صحیح کام تو اُسے بدلنا ہے، سو وہ فکر و دانش کے پیکر ہونے کے ساتھ جہدِ مسلسل کی بھی تصویر تھے، یعنی عالمِ باعمل تھے۔ اُن کے دائرۂ کار کا نقطۂ آغاز خود اُن کا اپنا گھر تھا، یعنی وہ CHARITY BEGINS AT HOME کے قائل تھے، سو اُن کا پورا خانوادہ اُن کا ہم نوا اور ہم نظریہ تھا اور اُن سب کا عملی تعاون ڈاکٹر حسان کو حاصل تھا، خصوصیت کے ساتھ اُن کے دو بھائی ڈاکٹر محبوب اور فصیح الدین سالار اور اُن کی چھوٹی بہن اقبال سلطانہ ترقی پسند تحریکوں اور بائیں بازو کی سیاست کے علم برداروں کی صفِ اول میں شامل رہی ہیں۔ خواتین کے محاذ کی ایک اہم رہ نما کی حیثیت سے وہ جانی پہچانی جاتی ہیں اور انجمنِ جمہوریت پسند خواتین سے وابستگی اور اُن کی کارگزاریاں قابلِ فخر اور لائقِ تقلید کہلانے کا استحقاق رکھتی ہیں واضح رہے کہ انجمنِ جمہوریت پسند خواتین کی بانی محترمہ طاہرہ مظہر علی خاں نے ۱۹۵۰ء میں لاہور میں اِس کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۹۶۹ء میں اِس نے کراچی میں اپنی سرگرمی شروع کی تھی۔ محترمہ اقبال سلطانہ عوامی ورکرز پارٹی کی ایک انتہائی اہم رکن ہیں۔

ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن قیامِ پاکستان کے بعد طلبا کی ایک ایسی تنظیم کے طور پر ابھری تھی جو بائیں بازو کی سیاست اور جدوجہد کی قیادت وسیادت کا تفخر رکھتی ہے جس کے رہ نماؤں میں ڈاکٹر شیر افضل ملک، ڈاکٹر سرور، ڈاکٹر رحمان علی ہاشمی اور متعدد شخصیات کے نام شامل ہیں جن میں سے ایک نام ڈاکٹر محبوب کا بھی ہے فصیح الدین سالار صحافیوں کی تحریک کے بیحد فعال قائدین میں شامل تھے۔ مارکسی فلسفے کی روشنی سے اُن کی فکر ونظر کی دنیا بھی آباد تھی۔

ڈاکٹر حسان کا ایک بڑا عالمانہ کام کمیونسٹ مینی فسٹو کا اردو ترجمہ کرنا ہے۔ اُس کے متن کی تشریح کے حوالے سے اُنھوں نے حاشیے بھی لکھے جس کو اُن کی وفات کے بعد فصیح الدین سالار نے شائع کیا اور اُس کے مدون کی حیثیت سے ایک جامع پیش لفظ شاملِ اشاعت کیا اور کچھ حاشیے بھی لکھ کر متن کی تشریح کا کام مکمل کیا۔ اِسے فصیح الدین سالار کی بڑی کارگزاری قرار دیا جانا چاہیے۔ جہاں تک ڈاکٹر حسان کے اشتمالی منشور یعنی ترجمے کا تعلق ہے تو اِس باب میں ڈاکٹر حسان کا نقطۂ نظر یہ ہے جس کا اظہار اُنھوں نے متعدد بار کی صحبتوں میں مجھ سے دورانِ گفتگو میں کیا تھا کہ وہ اُن ترجموں سے جو اُس وقت تک چھپ کر کئی نسلوں سے تعلق رکھنے والے قارئین کے زیرِ معالعہ آچکے تھے وہ مطمئن نہیں تھے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کا یہ شاہکار جس نظریاتی اہمیت کا حامل تھا، اُس سے ایک دنیا آگاہ اور مستفید ہو چکی ہے، وہ اپنے طرزِ بیان وزباں اور انشاپردازی کے حوالے سے بھی ایک شاہکار تصنیف ہے۔ وہ کہتے تھے کہ مذکورہ ترجموں میں مفہوم کی ادائیگی ہوگئی ہے، مگر وہ کاٹ (SHARPNESS) جو کسی تصنیف کا وصفِ خاص ہے، وہ ترجمے میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اِس اعتبار سے کمیونسٹ مینی فسٹو کے نفسِ مضمون کی توانائی اور چابک دستی ترجمہ پڑھنے والوں کو میسر نہیں آتی، چنانچہ ڈاکٹر حسان کمیونسٹ مینی فسٹو کا ترجمہ کرتے وقت اپنی توجہِ خاص مرکوز رکھتے اور وہ ایک ایک جملے کا ترجمہ کرتے وقت غور وخوض میں پہروں وقت صرف کرتے تھے، چنانچہ اِس مختصر تصنیف کا ترجمہ کرنے میں اُن کے متعدد مہینے صرف ہوئے۔ ڈاکٹر حسان ویسے بھی طبعاً PERFECTIONIST تھے۔ اُن کی ایک اور اہم کتاب جو E. H. CAAR کی بین الاقوامی امور سے متعلق تھی اور جو کراچی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل تھی، اُس کا ترجمہ بھی عالمانہ ادراک و شعور کا حامل تھا۔ غرض یہ کہ ڈاکٹر حسان ایک بڑے دانش ور ہونے کے ساتھ ایک بڑے محقق اور اسکالر بھی تھے ہفت روزہ 'عوامی آواز' جس کے وہ مدیرِ اعلیٰ تھے، اُس کے اداریے اُن کی مذکورہ فکر و دانش کی گیرائی اور گہرائی کے حامل ہوتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان جس کے وہ عرصۂ دراز سے رکن رہے تھے، اُس کی وقت گزرنے کے ساتھ تقسیم در تقسیم ہوتی رہی چنانچہ اِس صورتِ حال سے بددل ہوکر وہ اِس سے تنظیمی طور پر علاحدہ ہوگئے، مگر اِس سے غیر معمولی نظریاتی وابستگی نے اُنھیں ۱۹۸۰ء میں کمیونسٹ لیگ کی تشکیل کی راہ دکھائی اور اُنھوں نے اپنا مشن اور عملی جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ خود کمیونسٹ لیگ کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے اور اُس کی بارہ رکنی مرکزی کمیٹی میں اُن کے علاوہ یہ اشخاص بھی اُن کے ساتھی بنے: کامریڈ لال بخش رند، اختر حسین، فصیح الدین سالار بابر ایاز، عنایت کاشمیری، نجمہ بابر، اقبال سلطانہ، محمود عزیز کرد، نور محمد اچکزئی اور ڈاکٹر شیر افضل ملک۔ کمیونسٹ لیگ بعد میں پاکستان ورکرز پارٹی میں مدغم ہوگئی۔

ذکر ڈاکٹر حسان کے خانوادے کا ہے جس کے تمام ارکان اُن کے نظریے سے متفق اور اُن کے آدرش کو رُوبعمل لانے کی جدوجہد میں حسبِ حالات اُن کے شریکِ سفر تھے۔ اِس خانوادے سے وابستگی ایک ایسے شخص کی پیدا ہوئی جو ڈاکٹر حسان کے نظریاتی شاگرد کہے جاسکتے ہیں، وہ ہیں معروف دانش ور وکیل اور سیاست کار جناب اختر حسین ایڈوکیٹ جو پہلے اِس خانوادے سے نظریاتی طور پر وابستہ ہوئے اور بعد میں ڈاکٹر حسان کی چھوٹی بہن جس کا ذکرِ خیر پہلے آچکا ہے، یعنی اقبال سلطانہ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ یہ دونوں جیون ساتھی بھی ہیں اور نظریاتی طور پر ایک دوسرے کے ہم نفس وہم قدم بھی۔ اختر حسین ایڈوکیٹ کا آبائی گاؤں ضلع جہلم پنجاب میں واقع ہے، مگر اُن کے شعور کا تمام تر سفر شہرِ کراچی میں ۱۹۶۳ء سے شروع ہوا۔ اختر حسین اپنے مارکسی نظریات کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن سے میرا عرصۂ شناسائی وآشنائی چار عشروں پر محیط ہے۔ ہم ایک دوسرے کے نظریاتی ساتھی ہیں۔ وہ وکلا برادری کی ایک محترم اور معتبر شخصیت ہیں اور بار کی سیاست میں بیحد فعال ہیں۔ وہ ۱۹۸۴-۸۵ میں کراچی بار ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے، ۲۰۰۵ء میں سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے سندھ بار کونسل کے رکن اور پھر اُس کے وائس چیرمین منتخب ہوئے۔ ۲۰۱۱ء میں وہ پاکستان بار کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور ۲۰۱۵ء تک اِس منصب پر فائز رہے۔ اِن حوالوں سے اختر حسین کی مقبولیت اور وکلا برداری میں اُن کے مقام ومنصب کا اندازہ ہوتا ہے۔ اختر حسین کی ادب کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی بھی کئی عشروں پر محیط ہے اور اُن کی بائیں بازو کی سیاست کی زندگی بھی چار عشروں پر محیط ہے۔ اِس وقت اختر حسین ملک کی ایک اہم سیاسی پارٹی جس کے بانی صدر جناب عابد حسن منٹو ہیں، یعنی عوامی ورکرز پارٹی کے جنرل سکریٹری کے منصب پر فائز اور ماہ نامہ 'عوامی جمہوریت' کے موجودہ مدیر ہیں، گویا اختر حسین، ڈاکٹر حسان کے نظریاتی وارث ہیں۔ یہ سب کچھ میرے نزدیک ڈاکٹر حسان کی قربتوں کی دین اور عطا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''ایں خانہ تمام آفتاب است''۔☆☆

مشرق وسطیٰ کا بحران، پس منظر و پیش منظر

ڈاکٹر ریاض شیخ

گزشتہ قسط میں ہم مشرقِ وسطیٰ میں پائی جانے والی بے چینی اور بڑھتی ہوئی انتہا پسندی کا ایک تاریخی تناظر پیش کر چکے ہیں کہ کس طرح پہلی عالمگیر جنگ اور دوسری عالمی جنگ کے اختتام اور پھر سوشلسٹ نظام کے خلاف عالمی استعمار نے جہاں دیگر علاقوں میں سازشوں کے جال بچھائے وہیں مشرق وسطیٰ بھی اس سے مبرا نہیں رہا۔ ساتھ ہی ساتھ مشرق وسطیٰ کی وہ ریاستیں جنہوں نے اس عالمی استعماری نظام میں اگر تھوڑی سی بھی مزاحمت کرنے کی ٹھانی تو ان کے خلاف سازشیں کر کے وہاں حکومتوں کو عدم استحکام کا شکار کیا گیا اور پھر اندرونی عناصر کے ساتھ مل کر وہاں ایسے عناصر کی پشت پناہی کی جنہوں نے وہاں روشن خیالی اور ترقی پسندی کی سوچ کو پروان چڑھایا تھا لیکن گزشتہ ایک دہائی کی خانہ جنگی اور تباہی کے بعد اب کچھ ریاستوں میں حالات بہتری کی طرف لوٹ رہے ہیں جبکہ ابھی کچھ ریاستوں میں صورت حال مایوس کن ہی ہے۔

عالمی استعماری قوتوں کا نشانہ بننے والے ممالک میں ایک اہم ملک شام ہے شام میں صدیوں سے کئی مذاہب کے پیروکار اور کئی فرقوں سے تعلق رکھنے والے شہری بڑے پرامن طریقے سے رہتے چلے آئے تھے۔ ان کے درمیان تفرقہ پیدا کر کے مارچ ۲۰۱۱ء میں اس ملک کو خانہ جنگی کی طرف دھکیلا گیا لیکن بشار الاسد نے ابتدائی مشکلات کے بعد بالآخر روس کی مدد سے اس صورت حال پر اپنا کنٹرول بحال کر لیا لیکن اس عرصے میں استعماری قوتوں کی پالیسیوں کے نتیجے میں اربوں ڈالر کا نقصان ہوا۔ لیکن تازہ اطلاعات کے مطابق بشار الاسد کی افواج نے عوامی حمایت سے شام کا بیشتر علاقہ مذہبی انتہا پسندوں سے واپس حاصل کر لیا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں بے گھر ہونے والے شامی مہاجرین نے وطن واپسی شروع کر دی ہے اور اس سلسلے میں لبنان سے پہلا قافلہ واپس وطن پہنچ چکا ہے ان برسوں میں بے وطن ہونے والے شامی مہاجرین نے جن مشکلات کا سامنا کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک الگ داستان ہے۔ شام کا کھربوں ڈالر کا نقصان ہوا۔ مشرق وسطیٰ کا ایک نسبتاً ترقی یافتہ ملک تباہ و برباد کر دیا گیا لیکن امید ہے کہ صورت حال بہتری کی طرف جائے گی۔

اسی طرح یمن میں بھی کسی حد تک بہتری ہو رہی تھی لیکن سعودی عرب کے زیر قیادت نام نہاد اسلامی محاذ نے یمن کی بندرگاہ پر حملے شروع کر دیئے ہیں تاکہ حوثیوں کو بے دخل کر کے وہاں دوبارہ اپنی پسند کی حکومت قائم کی جائے۔ اس صورت حال میں یمن آئندہ کچھ عرصے غیر محفوظ اور محاذِ جنگ بنا رہے گا اس کے مقابلے میں عراق میں صورت حال بڑی حد تک بہتری ہوئی ہے اور گزشتہ ماہ ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں ایک بار پھر جمہوری عمل کو آگے بڑھنے کا موقع ملا ہے اور عراقی حکومت نے ایران اور سعودی عرب کی لڑائی سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا ہے یقیناً اس سے عراق میں فرقہ وارانہ لڑائی کے خاتمے میں مدد ملے گی۔

لیکن اس ساری صورتحال میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب یہ خبر آئی کہ سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ سلیمان نے گزشتہ ہفتہ اردن میں خفیہ طور پر اسرائیل کے وزیراعظم سے ملاقات کی۔ اس سے قبل شہزادہ سلیمان جنوری کے ماہ میں فلسطینی صدر محمود عباس کو اس بات پر مجبور کرتے رہے کہ وہ اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی کارروائیوں کو رکوائیں اور اسرائیل سے اس کی شرطوں پر معاہدہ کریں ورنہ فلسطینیوں کی ہر قسم کی امداد بند کر دی جائے گی۔ لیکن عباس نے یہ باتیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کے باعث گزشتہ کئی ماہ سے اسرائیل اور اس کی مسلح افواج نہتے فلسطینیوں پر فائرنگ اور شیلنگ کر کے سینکڑوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ اردن میں شہزادہ سلیمان اور اسرائیلی وزیراعظم کی ملاقات کا سب سے اہم ایجنڈا ایران کے خلاف مشترکہ کارروائیاں کرنے کا تھا ایران جو کہ ۲۰۱۵ء کے معاہدے کے تحت اپنے ایٹمی ہتھیاروں کے منصوبے پر مزید پیش رفت روک چکا ہے لیکن امریکی صدر ٹرمپ کی احمقانہ پالیسیوں کے نتیجے میں امریکہ اب نہ صرف خود اس معاہدے سے الگ ہو چکا ہے بلکہ یورپی یونین پر بھی دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ ایران سے اپنے تعلقات ختم کر کے اس پر دوبارہ پابندیاں عائد کر دیں لیکن یورپ اب امریکہ کے ساتھ

چلنے پر تیار نظر نہیں آتا خصوصاً فرانس اس کے لیے کسی بھی طور پر تیار نہیں کیونکہ ایران نے حالیہ عرصے میں فرانس کے ساتھ ہوائی جہازوں کی خریداری کے لیے کئی ارب ڈالر کے معاہدے کر لیے ہیں اسی طرح یورپ کے دیگر ممالک بھی ایران کی منڈی اور اس کے وسائل پر نظر رکھے ہوئے ہیں اس پریشانی کے باعث سعودی عرب' اسرائیل کے ساتھ مل کر ایران کا گھیراؤ کرنا چاہتا ہے لیکن سعودی عرب کو اس سے قبل ایک مزید ناکامی لبنان میں دیکھنے کو ملی جب لبنانی وزیراعظم سعد ہرارے نے ابتدائی طور پر سعودی دباؤ میں استعفیٰ دے دیا تھا لیکن بعدازاں واپس لے لیا اس طرح لبنان ایک بڑی خانہ جنگی سے بچ گیا۔ لبنان اس سے قبل ایک طویل عرصے تک خانہ جنگی کا شکار رہ چکا ہے۔

سعودی عرب کا ایک اور شکار قطر ہے۔ قطر نے خطے میں سعودی عرب کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے ایک آزادانہ خارجہ پالیسی اپنانے کا فیصلہ کیا۔ زمینی طور پر سعودی عرب کے پڑوس میں واقع ہونے کے باعث قطر بڑی حد تک سعودی عرب پر انحصار کرتا ہے۔ سعودی عرب نے نہ صرف خود قطر کا بائیکاٹ کر رکھا ہے بلکہ دیگر عرب ریاستوں کو بھی ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہے جس میں سرفہرست متحدہ عرب امارات شامل ہیں۔ سعودی عرب کو قطر سے دیگر شکایات کے ساتھ ساتھ الجزیرہ ٹیلی ویژن کی آزاد اور غیر جانبدارانہ پالیسیوں پر بھی اعتراض ہے۔ قطر نے حالیہ ماہ میں کئی اہم اعلانات کیے ہیں جس سے سعودی عرب اور علاقے کے دیگر ممالک کو پریشانی لاحق ہوگئی ہے اس مد میں دو اقدامات اہم ہیں اوّل تو قطر نے اپنے ملک میں رہائش پذیر غیر ملکی باشندوں کو مزید حقوق دینے کا اعلان کیا ہے اور دوسرا یہ کہ غیر ملکی محنت کشوں کے لیے بھی کم از کم اجرتیں مقرر کرنے اور ان کے لیے بہتر قوانین بنانے کا اعلان بھی کیا ہے۔ ۲۶ لاکھ کی آبادی کے اس ملک میں قطریوں کی اپنی آبادی صرف تین لاکھ ہے جو کل آبادی کا صرف ۱۲ فیصد ہے۔ جبکہ ۸۸ فیصد آبادی غیر ملکی محنت کشوں پر مشتمل ہے۔ قطر غیر ملکی باشندوں کو اپنی ریاست کا حصہ بنا کر اپنی آبادی میں اضافہ کرنا چاہتا ہے ورنہ صرف تین لاکھ کی آبادی کا یہ ملک پڑوس کے ایک بڑے ملک یعنی سعودی عرب کا سامنا نہیں کر سکتا۔ جبکہ قطر کا دوسرا اقدام غیر ملکی محنت کشوں کے لیے بہتر اجرتوں کا اعلان ہے متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب اس پیش رفت سے شدید پریشان ہیں ان کا خیال ہے کہ اس صورت حال کے باعث مستقبل میں ان ممالک کے محنت کش بھی ایسی ہی مراعات کے مطالبات کر سکتے ہیں۔ مزید براں قطر کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے خطے کے دیگر ممالک بھی سعودی عرب کے اثر سے نکل سکتے ہیں۔

سعودی عرب کو اس سلسلے میں مصر' متحدہ عرب امارات' اسرائیل' اردن اور پھر امریکہ کی مکمل تائید و حمایت حاصل ہے۔ بحرین جو کہ اپنی اکثریتی شیعہ آبادی سے پہلے ہی خوفزدہ ہے وہ بھی سعودی عرب کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔

اس صورت حال کے باعث جہاں ایک طرف مشرق وسطیٰ میں شام عراق اور لبنان کی صورت حال بہتر ہوتی نظر آ رہی ہے تو دوسری طرف سعودی عرب اور ایران کے تنازعے اور اس میں اسرائیل اور امریکہ کے مکمل طور پر سعودی عرب کے ساتھ کھڑے ہونے کے باعث علاقہ کی صورتحال بہت جلد بہتر ہوتی نظر نہیں آتی۔ (جاری ہے)

شاہد رضوی

شہرِ وفا

ممکن نہیں کہ جراتِ اظہار چھین لو
ہم سے ہمارے عشق کا آزار چھین لو
دل سے خیالِ حسنِ طرحدار چھین لو
سانسوں سے خوشبو زُلف سے مہکار چھین لو
یادوں کے جگمگاتے ستارے بجھا سکو
ہاتھوں سے لمحے لمحوں سے رفتار چھین لو
قندیلِ شب ستارۂ صبحِ بشر ہیں ہم
روشن ہے اپنی طبعِ بیدار چھین لو
چلتی ہوئی نسیم میں پھولوں کا پیار ہے
چلتی ہوئی نسیم سے یہ پیار چھین لو
رگ رگ سے اس جمال کا افسوں نکال دو
مے سے نشاط حسنِ غمِ یار چھین لو
ممکن نہیں کہ جراتِ اظہار چھین لو

رسالہ ''عوامی جمہوریت''

شاہ محمد مری

ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' کا طرز اپنے سابقہ پیش رو اخباروں کی طرح تھا۔ اس کے سرورق کے اوپر کی پٹی پر دائیں طرف درانتی پکڑے ایک کسان، ہتھوڑا اٹھائے ایک مزدور اور کتاب لیے ایک طالب علم نے کرمل کر پرچم اٹھایا ہوا ہے اور طالب علم نے انگلی سے مصمم عزم کے ساتھ پٹی کے درمیان میں چھپے موٹے لفظ ''عوامی جمہوریت'' کی طرف بطور منزل اشارہ کر رکھا ہے۔ ''عوامی جمہوریت'' کی سرخی کے ایک طرف ہفت روزہ لکھا ہے اور دوسری جانب لاہور۔ اُس کے نیچے ایڈیٹر، سید مطلبی فرید آبادی لکھا ہے اور اس کے نیچے قیمت 25 پیسے بائیں طرف چوکھٹے میں سالانہ بارہ روپے، ششماہی چھ روپے اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک 3 پونڈ اور عام ڈاک ایک پونڈ درج ہے۔

مگر ہمارا تجربہ رہا ہے کہ کوئی نہ تین پونڈ دیتا تھا اور نہ 25 پیسے۔ سی آر اسلم نے اپنے تئیں کچھ دوست بنا رکھے تھے جو اخبار کو چلانے کا خرچہ اٹھاتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ان چندہ دہندگان کی تعداد نصف درجن سے زیادہ نہ تھی۔ اور ان میں سے دو ایک ہی پارٹی افراد یا نظریاتی لوگ تھے۔ بقیہ تو اُس کے ذاتی جان پہچان کے ایسے دوست تھے جن پر جاسوسی اداروں کو شک تک نہ گزرتا تھا۔ یہ گویا سی آر اسلم کی طرف سے اخبار کے مالی وسائل کا ایسا ذریعہ تھے جو مستقل بھی تھے اور اُن پر سرکاری نظر بھی نہ پڑتی تھی۔ تیسری دنیا کی بنیاد پرست ترین، مارشل لا زدہ اور عوام کی ناترس دشمن ریاست میں ایسا ہی تخلیقی طریقہ چلانا احسن طریقہ تھا۔ کارکنوں میں غربت اور تنظیم کی کمی کی وجہ سے 25 پیسے دینے کی عادت نہ تھی۔ (آج بھی ایسا ہی ہے!۔ اور صرف ''عوامی جمہوریت'' کے ساتھ ہی ایسا نہیں بلکہ روشن فکر سارے رسائل کے ساتھ ایسا ہے)۔

13 جون 1970 کے شمارے میں مال روڈ لاہور کی کتابوں کی دکان ''کلاسیک'' کو جلا ڈالنے کی خبر پہ ایک مضمون ہے۔ دکان پر سوشلسٹ لٹریچر فروخت کرنے کا الزام لگایا گیا اور مالک کو دکان بند کرے ورنہ۔۔۔ جیسی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ اور بالآخر دکان جلا دی گئی۔ اخبار نے اس خبر نما مضمون میں اسے طبقاتی جنگ میں دشمن طبقات کا ایک کامیاب اور ہمہ وقت کارگر حربہ قرار دیا۔ اس نے عوام کو ایسے ہتھکنڈوں سے ہر دم چوکس رہنے کا کہا اور اپنے سیاسی کام کو احتیاط مستعدی اور ہوشمندی سے آگے بڑھانے کا مشورہ دیا۔ اخبار کے مطابق اسی سیاسی کام نے امریکی سامراج، اجارہ دار سرمایہ داروں جاگیرداروں اور ان کے ایجنٹوں بالخصوص مودودی جماعت کے، حواس باختہ کر دیے ہیں''۔ ہم نے دیکھا کہ پاکستان کی بعد کی تاریخ بھی ایسے الزامات اور واقعات سے بھر پڑی ہے۔ نہ صرف دکان جلا دی گئیں بلکہ لوگوں کو قتل کر دیا گیا، وطن بدر ہونے پر مجبور کیا گیا اور ایسے الزامات لگا کر حتی کہ بورژوا پارٹیوں کو بھی الیکشنوں سے دور رکھا گیا۔

اس شمارے میں جناب حیدر بخش جتوئی کے انتقال کی خبر سیاہ چوکھٹے میں دی گئی۔ ''مرحوم کافی دنوں سے علیل تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس کا دعوت نامہ جب انہیں بستر مرگ پر دیا گیا تو تمام مغربی پاکستان کے کسانوں کے اجتماع پر انہیں خوشی سے زیادہ اس لیے رنج ہوا کہ وہ اپنی علالت اور نقاہت کے سبب اس تاریخی اجتماع میں شرکت سے معذور تھے۔ اس بے بسی نے انہیں زار وقطار رلا دیا۔ ان کا وہ پیغام جو کسان کانفرنس میں پڑھا گیا اُن کے اس وقت کے قلبی تاثرات کا ترجمان تھا۔ وہ پاکستان کے اس طبقہ کے مخلص کارکن تھے جس کی پسماندگی کو ختم کیے بغیر آزاد و خوشحال اور جمہوری پاکستان کی تعمیر ناممکن ہے۔

''سندھ میں مرحوم نے ہاری تحریک کے منظم کرنے میں دوسرے رفیقوں کے تعاون سے کافی کوششیں کیں۔ انہوں نے ہاریوں کے مسائل اور اُن کے اسباب کو بخوبی سمجھا اور حل کرنے کے لیے مردانہ وار مصائب کا سامنا کیا، جیلوں کی اذیتیں جھیلیں، نام نہاد سندھی راہنماؤں کے ہاتھوں دکھ اٹھائے جو اپنی جاگیردارانہ رقابتوں میں ہاریوں کو استعمال کرنے کے لیے قوم پرستی کا چولہ پہن کر سامنے آتے رہے۔ مسٹر حیدر بخش جتوئی کی وفات پاکستان کی کسان تحریک بالخصوص سندھ کی ہاری تحریک کے لیے ایک افسوسناک سانحہ ہے۔ سندھ کے کسانوں نے اپنا ایک بیش قیمت اور مخلص فرزند کھویا ہے''۔

اس سے اگلے شمارے میں تو جتوئی صاحب کی وفات پر پارٹی کی نیشنل کونسل کی جامع قرار داد موجود ہے: ''جناب حیدر بخش جتوئی اُن چند رہنماؤں سے تھے جن کے ذکر کے بغیر سندھ کی پچھلی نصف صدی کی کوئی تاریخ

مکمل نہیں ہوسکتی۔ جتوئی صاحب نے سندھی کسانوں کے شعور کو بلند کرنے، ان کو منظم کرنے، اور سندھ کے متشددانہ جاگیرداری نظام کے خلاف جدوجہد کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ جتوئی صاحب نہ صرف ایک سیاسی راہنما تھے بلکہ سندھی زبان کے ایک بڑے شاعر بھی تھے۔ اور جس طرح ان کی سیاست ترقی پسند شعور سے پروان چڑھی تھی اسی طرح ان کی شاعری بھی قومی آزادی اور وطن دوستی کے نظریے مالا مال تھی''۔

چونکہ 1970 کے الیکشن قریب تھے، اس لیے ایک مضمون میں اخبار نے الیکشن کے بارے میں اپنی پوزیشن واضح کی۔ اخبار نے پارٹی کی طرف سے الیکشن میں اپنے نمائندے کھڑا کرنے کا فیصلہ چھاپتے ہوئے، مگر خبردار کیا کہ:

''سیاسی جمہوریت معاشی جمہوریت کے بغیر بے معنی ہے، عوامی مسائل عوام کی مستقل اور لگاتار جدوجہد ہی سے حل ہوسکتے ہیں۔ سامراجی عہد میں سرمایہ دار قیادت نہ جمہوریت لاسکتی ہے اور نہ عوام کے مسائل حل کرسکتی ہے۔ تاریخ کے اس دور میں یہ کام مزدور طبقے کی قیادت، مزدوروں اور کسانوں کا اتحاد اور اُن کی منظم اور باشعور جدوجہد ہی سے تکمیل کو پہنچ سکتا ہے''۔

شمارے کا آخری صفحہ ''لینن اور دیہات کے عوام'' نامی مضمون سے مزین ہے۔ واضح رہے کہ اخبار اُس وقت لینن کی صد سالہ سالگرہ مناتے ہوئے ایسا کر رہا تھا۔

27 جون 1970 کے شمارے میں مجھے اس میں ایک زبردست ٹکڑا ملا ہے، اولین صفحے پر: ''۔۔۔ دانشوروں میں یہ غلط فہمی اکثر پائی جاتی ہے کہ ترقی پسند کارکن ہر تحریک میں گھس کر اُسے ترقی پسند تحریک بنا سکتے ہیں۔ اور اُس کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے درست لائنوں پر چلا سکتے ہیں۔ (اب بھی آپ کو ایسی بے شمار آوارہ روحیں ملیں گی جو سرکار دربار اور عوام الناس میں مقبول جگادری لیڈروں کو تن تنہا راہ راست پر لانے کی کوششیں کرتی نظر آتی ہیں۔ کوئی پیپلز پارٹی کو لیننی پارٹی بنانے کی جگالی کرتا نظر آتا ہے تو کوئی ایم کیو ایم کو مارکسسٹ پارٹی بنانے پہ تلا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ یار لوگ نواز شریف کو بھی چے گویرا کہنے، بنانے کی بے برکت دلیلیں دیتے نظر آتے ہیں) اخبار نے لکھا: ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر وہ تحریک جس میں عوام شریک ہوں عوامی تحریک نہیں ہوتی۔ بلکہ عوامی تحریک وہ ہے جو عوام کے طبقاتی مفادات کی نمائندگی کرے اور جس میں شریک ہونے سے اُن کا طبقاتی شعور بلند ہو، طبقاتی اتحاد بڑھے اور طبقاتی تمیز گہری اور واضح ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ صرف ترقی پسند نظریہ ہی ترقی پسند تحریک کو پیدا کرسکتا ہے اور جو تحریک ترقی پسند نظریے نے پیدا نہ کی ہو خواہ اس میں عوام شریک بھی ہوں ترقی پسند نہیں ہوتی اور نہ اُسے ترقی پسند بنایا جاسکتا ہے۔''

مندرجہ بالا پیراگراف میں نے خصوصی طور پر اس لیے منتخب کیا ہے کہ نوجوان قاری بات سمجھ سکے۔ اُسے معلوم ہو کہ آج کی سیاست میں جو رویے اور رجحانات اُسے ملتے ہیں وہ نئے نہیں ہیں۔ یہ پچاس ساٹھ برس قبل کے رجحانات ہیں۔ چونکہ ہماری تحریک کی تاریخ جامع اور یکجا طور پر میسر نہیں ہے اس لیے نوجوان کنفیوز ہوجاتا ہے اور اُس کا وقت ان امور پر سوچنے پہ ضائع ہوتا ہے۔ وہ شخصیات کے ''ترقی پسند درباریوں'' کے پروپیگنڈہ میں آکر ہر بورژوا اور عوام دشمن سیاسی پارٹی میں انقلاب ڈھونڈنے کے سرابی راستے پر چل پڑتا ہے۔ کاش ہم نوجوان نسل کو تجربات کا وہ خزانہ ایک مجتمع اور جامع صورت میں مہیا کرسکیں!۔

اسی مضمون میں ہمارا یہ ٹیچر اخبار ہمارے لیے ایک اور اہم سوال کو چھیڑتا ہے، اور پھر اُس کا جواب دیتا ہے۔ سوال ہے: ''جمہوریت کیا ہے''؟۔ جواب ہے کہ: سرمایہ داروں کے لیے: ''پالیمانی طرزِ حکومت، فیڈرل سسٹم، براہِ راست انتخاب، صوبوں کی آبادی کی بنیاد پر حق نمائندگی۔۔''۔ مگر اصلی جمہوریت میں ''سامراجی اثرات سے نجات اور معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانا بھی شامل ہیں''۔۔۔ یہ علمی مضمون سی آر اسلم کا لکھا تھا۔

اخبار نے اپنی پارٹی (نیشنل عوامی پارٹی) کی نیشنل کونسل کے سہ روزہ اجلاس کی روداد بھی چھاپی ہے جو 27 جون 1970 کو شروع ہوا تھا۔ نیشنل کونسل نے اگلی ٹرم تک کے لیے پارٹی کے نئے عہدیدار چنے۔ صدر مولانا عبدالحمید خان بھاشانی، اور جنرل سیکریٹری سی آر اسلم منتخب کیے گئے۔ میٹنگ نے آنے والے الیکشنوں میں پارٹی کے امیدواروں کے فیصلے کے لیے ایک آٹھ رکنی پارلیمنٹری بورڈ بھی منتخب کی۔

اس شمارے میں ایک اور کمال بات کی گئی۔ ایسی بات آج کی ہماری نئی نسل کے لیے بھی ایک سبق کا درجہ رکھتی ہے۔ ''یکم جولائی (1970) سے ون یونٹ ختم ہوگیا ہے۔۔۔ پندرہ سال پہلے جب وہ یونٹ بنایا گیا تھا تو تمام سیاسی کارکنوں اور محنت کش تنظیموں کے حقیقی لیڈروں نے اس غیر جمہوری اقدام کی کھل کر مذمت کی تھی۔ ون یونٹ توڑنے کے ہمارے اس مطالبے کو پاکستان اور نظریہ پاکستان کا دشمن کہا جاتا رہا۔ ون یونٹ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے اس کے جلسوں پر پتھراؤ کیا گیا۔ اس کے کارکنوں کو جیل میں ڈالا گیا اور ان کی

جائیدادیں ضبط کی گئیں۔ آج جب ون یونٹ ٹوٹ گیا ہے تو وہی سیاسی جماعتیں اور افراد جو ون یونٹ کو اپنا سیاسی ایمان سمجھتی تھیں، اُس کے ٹوٹنے اور صوبوں کے قیام پر جشن منانے والوں میں شامل ہیں''۔

اور یہ صرف ون یونٹ تک محدود نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سیٹو سنٹو سے نکلنے کے لیے قربانیاں جمہوری سیاسی ورکرز نے دیں۔ مگر اس کے ثمرات لینے یہ موقع پرست بورژوا سیاست دان آگے آگے تھے۔ مارشل لاؤں کے خاتمے کی جدوجہد میں شاہی قلعے اور پھانسی گھاٹ روشن فکر سیاسی ورکرز نے آباد کیے تھے۔ مگر جب مارشل لا گیا تو مارشل لا کی گود میں بیٹھے لوگ وہاں سے کود گئے اور جمہوریت کے ٹھیکیدار بن کر اقتدار پہ بیٹھ گئے۔ اُس روز کوئی دوست کہہ رہا تھا کل جب عوامی جمہوری انقلاب ہوگا تب بھی اقتدار لینے یہی بورژوا موقع پرست سیاستدان آگے آگے کھڑے ہوں گے، جو ہمیں شاہی قلعوں، پھانسی گھاٹوں، انڈر گراؤنڈ اور جلاوطنی میں بھیجتے رہے تھے۔

سبق یہ ہے کہ انقلابی لوگ خبردار رہیں کہ اپنی قربانیوں کا مالک خود ہوا جائے اور اپنی طبقاتی جدوجہد کی کسی کامیابی کا کریڈٹ اور فائدہ دشمن کو لینے نہ دیا جائے۔

ہم جس وقت یہ سطور لکھ رہے ہیں تو ملک میں 2018 کے الیکشنوں کی گہما گہمی شروع ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ آج سے نصف صدی پہلے 1970 کے الیکشنوں اور آج کے الیکشنوں میں کوئی فرق ہے؟۔ (عوامی جمہوریت، 25 جولائی 1970)۔

''گلیوں، بستیوں، اور دیہات میں جھنڈے لگائے جا رہے ہیں۔ انتخابی دفاتر قائم کیے جا رہے ہیں۔ ریڈیو ٹی وی کے علاوہ روزانہ اخبارات کسی نہ کسی جلسے، عصرانے یا استقبالیے کی خبروں اور بیانات سے بھرے نظر آ رہے ہیں ۔۔۔ وہ جاگیری، اجارہ دار سرمایہ داری اور سامراجی مفادات کے خاتمے کا نام لیے بغیر کہتی ہیں کہ وہ برسرِ اقتدار آ کر معاشرے میں بنیادی تبدیلی لائیں گے ۔۔۔ (آج کے عمران، نواز شریف، پیپلز پارٹی اور دیگر ساری پارلیمانی پارٹیوں کی طرح)۔ مذکورہ بالا پارٹیوں کے سربراہ تمام تر وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دور اقتدار میں اُن سیاسی ورکروں کی ہمیشہ مخالفت اور مذمت کی، انہیں جیل خانوں میں رکھا اور ہمیشہ غدارانِ وطن اور دشمنانِ اسلام کے اُن پر لیبل لگائے جنہوں نے معاشرے میں بنیادی تبدیلی لانے کے لیے سامراجی مفادات، اجارہ دار سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خاتمے کے لیے جدوجہد کی۔

''۔۔۔ان میں پیپلز پارٹی کے سربراہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جیسے لوگ بھی موجود ہیں جو دورِ ایوبی کے گناہوں کی آلودگی سے اپنے آپ کو پاک کرنے کے لیے کئی دفعہ توبہ کر چکے ہیں۔

''۔۔۔ہم مشورہ دیں گے کہ۔۔۔ ہر پارٹی اور فرد کے حال اور مستقبل سے متعلق اس کے عزائم کے جائزے کو کسوٹی قرار دیا جائے۔

ہمارا ''مطالبہ ہے کہ ملک کے تمام طبقات کو تناسب آبادی کے لحاظ سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی دی جائے۔ یہی صحیح معنوں میں جمہوریت کی بحالی ہے جس کے تسلیم کیے جانے سے 95 فیصد عوام کو وہ اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے جس سے آج تک انہیں محروم رکھا گیا ہے۔۔۔۔ ملک کی 95 فیصد آبادی پر مشتمل کسان مزدور، اور دانشور طبقات سے متعلق عوام موجودہ طریقہ انتخاب کے ذریعے اپنا حق نمائندگی استعمال ہی نہیں کر سکتے''۔

ایک اور کمال مضمون کی طرف آیئے۔ کچھ لوگوں کو موروثی بیماری لگی رہتی ہے لیفٹ رجحانات رکھنے والی بورژوا پارٹیوں سے اتحاد کرنے کی۔ 1970 میں بھی یہ بیماری موجود تھی۔ دیکھیے: ''مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے یہ کہہ کر کہ الیکشن کے لیے وہ کسی سیاسی پارٹی سے اتحاد نہیں کرنا چاہتے۔ اُن کا اتحاد عوام یعنی مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں سے ہے۔ بائیں بازو کے اتحاد کا نعرہ لگانے والے ان نام نہاد ترقی پسندوں بلکہ بزعم خود ''انقلابیوں'' کی کھوپڑی میں ایک اور چپت رسید کی۔ یہ ہی کیفیت ان ''ترقی پسندوں'' پر گزر چکی ہے جو شیخ مجیب الرحمٰن کی ''انقلابی'' قیادت سے اپنا نکاح باندھنے کے لیے بے قرار تھے۔ مگر عروسی لباس میں جہیز کے لیے جب دولہا کے دروازے پر پہنچے تو دھتکار دیے گئے۔

''ان نام نہاد ترقی پسندوں نے ہمیشہ بورژوا، اور پیٹی بورژوا جماعتوں اور عناصر کی دُم سے ترقی پسندوں کے باندھنے کو بائیں بازو کے اتحاد کا نام دیا ہے۔ اور اپنے متواتر عمل سے سیاسی کارکنوں کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے اور ان کے سیاسی شعور کو کند کرنے کا شرمناک فریضہ انجام دیا ہے۔ اُن کی ہر موقع پرستی حکمران طبقے کی استحصالی رقابتوں سے مرتب ہونے والی سیاست کی پرچھائیں کے پیچھے دوڑی ہے اور اسے انہوں نے ترقی پسندی کا نام دیا ہے جو سیاست عوام کے بجائے حکمران طبقہ کے کسی ایک دھڑے کے استحکام کی سیاست ہے اور جو مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کے اتحاد اور اس اتحاد سے مستحکم ہونے والی مزدور قیادت کے بجائے خود اسی رجعتی طبقاتی قیادت کے گرد مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کو سربسجود رکھنے کی خواہش مند ہوتی ہے''۔

☆.....☆

متبادل ممکن ہے!

(عوامی ورکرز پارٹی کے منشور سے اخذ)

انتخابات 2018ء کا منشور

پاکستان میں عام انتخابات 2018ء کو عوامی ورکرز پارٹی ایک ایسا موقع سمجھتی ہے جس میں ہم اپنی کئی برسوں سے جاری جدوجہد اور اپنے پروگرام کو بڑے پیمانے پر عوامی حلقوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ تصور عام ہے کہ سیاست محض جاگیرداروں، بڑے زمینداروں، سرمایہ داروں اور طاقتور لوگوں کا کام ہے۔ اور اگر سیاست ان ہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی تو وہ ریاست کی مشینری کو اپنے ہی طبقاتی مفاد میں استعمال کریں گے کیونکہ ان کے نزدیک عوامی فلاح و بہبود کوئی معنی نہیں رکھتی، وہ اس کو محض نعرے بازی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عوامی ورکرز پارٹی جو اپنے منشور و دستور کے لحاظ سے اس ملک کے مزدوروں، کسانوں اور تمام محنت کار عوام کی ترقی پسند پارٹی ہے جس کا مقصد استحصال کی تمام اشکال سے نجات اور ریاست پر محنت کش عوام کی عمل داری ہے اور اس کے نزدیک عوام کی تعلیم، روزگار، صحت و علاج معالجے، رہنے کے لیے چھت/ رہائش کا حق بنیادی ترجیحات میں شامل ہے ہم ان انتخابات میں پاکستان کے محکوم عوام کو یہ یقین دلائیں گے کہ عوام کی طاقت سے ہم اپنے سماج اور حکمرانی کے نظام کو بدل سکتے ہیں۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ محنت کش طبقات کے ساتھ ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ جو نوجوانوں پر مشتمل ہے انہیں میدان میں اترنا پڑے گا تاکہ تعلیم، روزگار، صحت، رہائش، پانی، خوشگوار ماحول جو انسانی زندگی کی بنیادی ضرورتیں ہیں ان کے حصول اور حقیقی جمہوری اداروں کے قیام کی ضمانت دی جا سکے۔

تبدیلی و متبادل کیا ہے؟

☆..... جاگیرداری و قبائلی باقیات اور بڑی زمینداری کا خاتمہ:

پاکستان کے قیام کے ستر سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود یہاں اب بھی جاگیری و قبائلی باقیات و بڑی زمینداریاں قائم ہیں آلات پیداوار و پیداواری رشتوں میں تبدیلی کے باوجود ہزاروں ایکڑ زمین کے مالک بڑے زمیندار وں کے سماجی اثرات موجود ہیں اور اسی کی بنیاد پر 60 فیصد سے زیادہ دیہی سماج میں ان کا سیاسی غلبہ ہے۔ موروثی زمینداروں کے علاوہ سول و فوجی نوکر شاہی کو زرعی زمینوں کی الاٹمنٹ سے غیر حاضر زمین داروں کا بڑا حصہ وجود میں آ گیا ہے جو اس پورے نظام کے محافظ بن گئے ہیں۔ اس لیے عوامی ورکرز پارٹی بنیادی زرعی اصلاحات نافذ کرے گی جس کے ذریعے 125 ایکڑ نہری اور 150 ایکڑ بارانی فی خاندان سے زائد زمین ہاریوں، کسانوں، مزارعوں اور کھیت مزدوروں میں بغیر کسی جنسی تفریق کے تقسیم کر کے دیہی معاشرے اور زرعی پیداوار میں منصوبہ بندی سے ترقی لائے گی۔

☆..... عوام دوست ترقیاتی منصوبہ بندی اور روزگار کی ضمانت:

آزاد منڈی اور نج کاری پر مبنی سرمایہ دارانہ عالمگیریت کی مخالفت کی جائے گی، قومیائی گئی صنعتوں کو فعال بنا کر محنت کشوں کی عمل داری قائم کی جائے گی۔ بڑی صنعتوں، فوج، اس کے اداروں اور سرکاری محکموں کی خودمختار صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا جائے گا۔

صنعتی ترقی کے لیے نجی سرمایہ کاری کی خاص کر پسماندہ علاقوں میں ترجیحی بنیادوں پر اجازت ہوگی۔ تمام صنعتوں میں مزدوروں کے جمہوری اختیار اور ہڑتال کے حق کی اجازت ہوگی۔ کثیر القومی سرمایہ کاری کے منافع کو عوامی مفاد میں طے کیا جائے گا۔ مزدوروں کو روزگار کی ضمانت ہوگی کم سے کم تنخواہ 30,000 (تیس ہزار روپے) ماہوار ہوگی۔ ٹھیکیداری نظام ختم کیا جائے گا۔ بے روزگاری اور بڑھاپے کا الاؤنس دیا جائے گا۔

☆..... غیر طبقاتی تعلیمی نظام:

انگریز کے دیئے ہوئے موجودہ طبقاتی تعلیمی نظام کا خاتمہ کر کے پورے ملک میں سائنسی بنیادوں پر ایک تعلیمی نظام نافذ کیا جائے گا۔ تعلیم کے نام پر تجارت اور لوٹ مار کا نظام ختم کیا جائے گا۔ تعلیم پر GDP کا کم از کم 10 فیصد خرچ کیا جائے گا۔

ہر شہری کو گریجویشن تک مفت تعلیم اور تعلیم کے بعد روزگار کی ضمانت دی جائے گی۔ مادری زبانوں میں تعلیم کو فروغ دیا جائے گا۔ تعلیمی اداروں میں طلبا یونینز بحال کی جائیں گی۔

☆.....مفت و معیاری صحت کا نظام

صحت کو بنیادی آئینی حق کے طور پر تسلیم کیا جائے گا اور صحت پر GDP کا کم از کم 10 فیصد خرچ کیا جائے گا۔ تمام عوام کو مفت اور ارزاں صحت کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ دوا ساز کمپنیوں کی لوٹ مار اور جعلی و غیر معیاری ادویات کے کاروبار پر پابندی لگائی جائے گی' خود مختار و نجی ہسپتالوں کی فیس اور اخراجات کو ریگولیٹ کیا جائے گا۔

☆.....رہائش کے حق کی ضمانت:

رہائش کو آئین کے تحت شہریوں کے بنیادی حق کے طور پر تسلیم کیا جائے گا۔ زرعی اصلاحات کے ساتھ دیہاتوں اور شہروں میں تمام محنت کش خاندانوں کی رہائش کے لیے منصوبہ بندی کی جائے گی۔ عوام کو مکان کی تعمیر کے لیے غیر سودی قرضے دیئے جائیں گے۔ کچی آبادیوں کو مالکانہ حقوق دیئے جائیں گے۔

☆.....صنفی برابری:

پاکستانی معاشرے میں طبقاتی و سماجی پسماندگی کی وجہ سے خواتین خطرناک حد تک مردوں کی بالادستی اور دوہرے اور تہرے استحصال کا شکار ہیں اس لیے خواتین معاشی' سیاسی وثقافتی پسماندگی اور تعلیم' صحت اور روزگار کے حصول میں بہت پیچھے رہ گئی ہیں' ساتھ ہی پدرسرانہ روایات اور امتیازی قوانین کی وجہ سے خواتین اور بچیاں آئے روز بدترین جبر وتشدد کا شکار رہتی ہیں۔ ہم نہ صرف صنفی امتیاز کا ہر لحاظ سے خاتمہ کریں گے بلکہ عورتوں اور بچیوں کو تعلیم' روزگار میں برابر کے مواقع اور برابر کام کے برابر معاوضے کو قانونی تحفظ دیں گے۔

☆.....قومی حقوق اور وفاقیت:

پاکستان ایک کثیر القومی اور کثیر السانی ملک ہے اس لیے اس میں بسنے والی تمام قوموں کی برابری کے اصول پر عمل کرتے ہوئے حقیقی وفاق قائم کریں گے جس میں تمام قومی اکائیوں کو اپنے معاشی وسائل پر دسترس ہو اور وفاق کے پاس صرف دفاع' خارجہ' کرنسی اور بین الصوبائی مواصلات کے محکمے ہوں گے۔

☆.....خارجہ پالیسی:

دنیا بھر میں امن اور جمہوریت کی حمایت کی جائے گی۔ ہمسایوں سمیت تمام ممالک سے برابری کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں گے امریکہ اور دیگر سامراجی ممالک کی معاشی سیاسی وفوجی بالادستی کی مخالفت کی جائے گی۔ قومی آزادی کی تحریکوں اور عوام دوست انقلابات کی حمایت کی جائے گی۔ پاکستان کے اندر اور دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی جائے گی۔

☆.....جمہوری وسیاسی آزادیاں:

کسی بھی ملک کی معاشی وسماجی ترقی جمہوری اور سیاسی آزادیوں کے بغیر بے معنی ہے اور جمہوری اداروں کی ترقی ومضبوطی کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کو بلا لحاظ مذہب وعلاقے زبان کے برابر آئینی و قانونی حقوق حاصل ہوں اور مذہب کو ریاستی معاملات سے مکمل طور پر الگ کیا جائے' سیاسی ومعاشی اختیارات کی تقسیم وفاق سے صوبوں اور صوبوں سے ضلعی و نچلی سطح تک مربوط سے کی جائے' ہمارے حکمران طبقات کے سیاست دانوں اور سیاسی پارٹیوں کی ان بین الاقوامی طور پر طے شدہ اصولوں سے کوئی کمٹمنٹ نہیں ہے بقول مشتاق احمد یوسفی'' جہاں لیڈر خود غرض' علماء مصلحت بین' عوام خوف زدہ اور راضی برضائے حاکم' دانشور خوشامدی اور ادارے کھوکھلے ہو جائیں تو جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کی راہ چل دیتی ہے۔''

عوامی ورکرز پارٹی ملک کو اس خودغرض' مصلحت اور خوف زدگی سے نکال کر جدوجہد کے ذریعے ایک حقیقی جمہوری سماج قائم کرنا چاہتی ہے جس کے لیے بنیادی آئینی وقانونی اصلاحات لائے گی!

ہم عوام سے اپیل کرتے ہیں

آؤ!

ہمارے ساتھ چلو

ہم ناممکن کو ممکن بنادیں گے

عوامی ورکرز پارٹی

ممتاز مارکسی دانشور پروفیسر یوسف حسن

امجد اسلام امجد

اک بے انت سمندر میری منزل اے دریا
لیکن خاک اڑائیں تیرے ساحل اے دریا
ہم بھی پربت کاٹتے ہیں اور مٹی چاٹتے ہیں
ہم بھی تیرے کنبے میں ہیں شامل اے دریا
سینوں اور زمینوں کو نہ اگر سیراب کریں
تیرا میرا ہونا ہے لاحاصل اے دریا
تیری لہریں رہ کر بھی ہم اپنی لہریں ہیں
مٹ جاتے ہیں اپنے آپ سے غافل اے دریا
کتنی عمروں سے میں تیرے ساتھ سفر میں ہوں
کھول اپنے اسرار کبھی تو اے دل اے دریا

یہ اس غزل کے چند اشعار ہیں جو مرحوم یوسف حسن کے زیر ترتیب شعری مجموعے سے مجھے برادر عزیز غافر شہزاد کی معرفت ملی ہے اور کل سے میں ایک بار پھر اس حیرت کدے میں گم ہوں کہ وہ کون سا پراسرار طریقہ ہے جس کے ذریعے فنا کا احساس جانے والوں بالخصوص اہل قلم کی تحریروں میں ان کو ایک سامنے کھڑی حقیقت کی طرح نظر آنے لگتا ہے یوسف حسن کے بارے میں سوشل میڈیا پر جو ایک بات بار بار دہرائی جا رہی ہے وہ اس کا ترقی پسند تحریک' کمیونزم اور غریب اور بے سہارا مخلوق سے گہری جذباتی اور نظریاتی وابستگی ہے جس کے ساتھ وہ ساری عمر بندھا رہا اس کا تعلق جہلم کے علاقے سے تھا اور میری اس سے پچاس سالہ رفاقت کی بنیاد اب کا وہ رشتہ تھا جس کا آغاز احمد ندیم قاسمی کے رسالے ''فنون'' کے دفتر اور صفحات سے ہوا جو براہ راست ملاقاتوں کی کمی کے باوجود ساری عمر نہ صرف قائم رہا بلکہ اس کی دوطرفہ گرمجوشی میں بھی کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ برصغیر کی ادبی فضا میں کمیونزم اور عوامی ادب کا اثر یوں تو انقلاب روس کے کچھ عرصے بعد ہی نظر آنا شروع ہو گیا تھا مگر اس کا باقاعدہ آغاز 1936 میں ترقی پسند تحریک کے قیام کے ساتھ ہوا جس کے کچھ عرصہ بعد سیاسی میدان میں کمیونسٹ نظریات کی حامل پارٹیوں کا دور شروع ہوا جن کا زیادہ زور اگرچہ تقسیم سے قبل کے متحدہ بنگال اور جنوبی ہندوستان میں تھا مگر عمومی طور پر سارا برصغیر اس کی لپیٹ میں آنے لگا تھا کہ دو عظیم جنگوں اور ہمسایہ ممالک چین میں انقلابی لہر کے فروغ اور سفر' کتابوں اور معلومات کی فراہمی میں آسانی اور پھیلاؤ کی وجہ سے دنیا سمٹتی اور برٹش راج کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد دونوں ملکوں کی نئی سیاسی اور نظریاتی ساخت میں تبدیلی کے باعث کمیونسٹ نظریات اور اس سے متعلق تحریکوں اور جماعتوں کو مختلف طرح کی رکاوٹوں اور پابندیوں سے گزرنا پڑا جس کے نتیجے میں نہ صرف ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم شکست و ریخت کا شکار ہوئی بلکہ پاکستان کی حد تک کمیونسٹ پارٹی کا بھی خاتمہ ہو گیا کہ یہاں ابھی زیادہ مقبول اور مضبوط ہو ہی نہیں پائی تھی البتہ بھارت کے کئی علاقوں میں یہ نہ صرف بہت حد تک قائم رہی بلکہ بعض ریاستوں میں یہ حکومتی عمل میں بھی شامل رہی اور آج بھی ہے البتہ ادبی حوالے سے دونوں جگہ پر ترقی پسند تحریک اپنے تسلسل کے باوجود کسی باقاعدہ تنظیم سے محروم ہو گئی 50 کی دہائی میں راولپنڈی سازش کیس اور کمیونسٹ جماعت پر باقاعدہ پابندی کے باعث ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم بھی مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر بند ہو گئی اس کے آخری سیکریٹری جنرل ہم سب کے ادبی گرو احمد ندیم قاسمی تھے۔

یہ تھی وہ فضا جس میں یوسف حسن مرحوم نے آنکھ کھولی' کمیونزم فکر سے اپنی فطری جذباتی و نظریاتی ہم آہنگی اور عوام دوستی کے باعث اس نے نہ صرف روس اور چین کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں لکھے جانے والے اشتراکی ادب کا بھرپور مطالعہ کیا بلکہ عملی طور پر بھی مزدور تنظیموں اور سیاسی انقلاب سے وابستہ تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا اس کی شاعری ہو یا نثر یا ادبی محفلوں میں کی جانے والی گفتگو اس نے ہر جگہ اپنی اس روش کو قائم رکھا وہ ملنے ملانے میں ایک بہت محبتی' سادہ اور ملنسار آدمی تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے نظریات کے ضمن میں بہت سخت گیر اور بعض صورتوں میں تلخ گفتار بھی ہو جاتا تھا اور یوں وہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو' کی ایک قدرے مختلف مگر چلتی پھرتی تصویر تھا۔ مجھے اس کی خرابی صحت کا علم اور اندازہ تو تھا مگر ۲۳ جون کو عزیز دوست خالد احمد مرحوم کے نام پر قائم کردہ ادارہ بیاض کے ادبی ایوارڈ کے موقع پر اختر عثمان نے اپنے شعری مجموعے پر ایوارڈ لیتے ہوئے جب اسے اپنی بیمار والدہ اور بستر مرگ پر پڑے ہوئے سینئر دوست یوسف حسن کے نام کیا تو میں چونکا کیونکہ عام طور پر کسی لاعلاج قرار دیے گئے مریض دوست یا عزیز کے بارے میں بستر مرگ کی ترکیب کے استعمال سے گریز کرتے ہیں تقریب کے بعد بھی ہجوم کی وجہ سے اختر عثمان سے تو بات نہ ہو سکی مگر احباب سے پتہ چلا کہ یوسف کی طبیعت واقعی بہت خراب ہے اور ماضی قریب کے جہلم سے متعلق دو اہم مرحوم شعرا تنویر سپرا اور اقبال کوثر کی طرح وہ بھی اب برسر راہ ہے ابھی اس سے رابطے اور ملاقات کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خبر بھی آ گئی جس سے کسی کو مفر نہیں۔ سو آخر میں اس کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہوئے اس کے چند شعر کہ اب اس نے ابد آباد میں زندہ رہنا ہے کہ فنکار کا فن اسے اس کی جسمانی عدم موجودگی کے بعد بھی زندہ رکھتا ہے

سب کی نظر میں آ جاتا ہے
چاند کسی بھی چھت پر نکلے
ہر میلے کی رونق تھے ہم
ہر میلے سے لٹ کر نکلے

کیا کہیں اس کو جو دھجی بھر زمیں بخشی گئی
اور سر پر چیتھڑا آسماں رکھا گیا
اس کنارے کوئی اپنا منتظر ہو یا نہ ہو
یہ بھی کیا کم ہے کہ ہم کو خوش گماں رکھا گیا
لوگ تو لوگ عقیدے بھی پگھل جاتے ہیں
تم نے دیکھی ہی نہیں گرمیٔ بازار ابھی
کوئی منزل بھی نہیں آخری منزل یوسف
منتظر اپنے ہی ہیں ہم کہیں اس پار ابھی

عوامی ورکرز پارٹی اور الیکشن 2018

عوامی ورکرز پارٹی نے 25 جولائی کو ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے ملک بھر سے کوئی 22 امیدوار بشمول دو خواتین ، میدان میں اتارے ہیں جن میں سے 8 قومی اسمبلی اور 14 صوبائی اسمبلیوں کے لئے مقابلہ کریں گے، ان تمام امیدواروں کا مختصر تعارف، ان کی سیاسی جدوجہد حسب ذیل ہے۔

قومی اسمبلی کے حلقوں کے لئے امیدواران کا تعارف۔

جناب فانوس گجر اگرچہ صوبہ خیبر پختون خوا سے تعلق رکھتے ہیں لیکن پورے ملک میں ان کی شخصیت کچلے ہوئے طبقے سے محبت کی وجہ سے ایک عوام دوست شخصیت ہے خاص طور اپنے حلقے میں انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز شخصیت ہیں، گزشتہ کئی انتخابات میں اپنے حلقے سے الیکشن لڑتے ہیں اور ووٹوں کی ایک قابل ذکر تعداد حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں عوامی ورکرز پارٹی کے صدر ہیں، بالخصوص صوبے اور اس ملک کی بائیں بازو کی سیاست سے بالعموم ایک طویل عرصے سے وابستہ ہیں پارٹی نے انہیں اپنی گزشتہ کانگریس منعقدہ 2016 میں اپنا سربراہ منتخب کیا، این اے 9 بنیر کے پی کے سے قومی اسمبلی کا لیکشن لڑ رہے ہیں۔

جناب بخت نصیب خان عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خوا کے ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں این اے حلقہ این اے 10 شانگلہ سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑ رہے ہیں ۔

جناب خالد محمود عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خوا کے ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں این اے حلقہ این اے 18 صوابی سے الیکشن لڑ رہے ہیں۔

جناب شاہد خان، عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خواہ کے ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں این اے حلقہ این اے 19 صوابی سے الیکشن لڑ رہے ہیں۔

جناب عمار رشید، عوامی ورکرز پارٹی اسلام آباد ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں محقق اور ماہر تعلیم ہیں انہوں نے ممتاز تعلیمی ادارے (LUMS) سے معاشیات اور سوشل سائنس میں بی ایس سی (آنرز) مکمل کیا جبکہ Sussex) University) سے (Developmint Studies) میں ماسٹر ڈگری حاصل کی، این اے حلقہ این اے 53 اسلام آباد سے الیکشن لڑ رہے ہیں۔

محترمہ عصمت رضا شاہجہاں، ضلع کرک کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے تعلق رکھتی ہیں، آپ 1983 میں ایک طلبہ لیڈر کی حیثیت سے اس انقلابی سیاست سے منسلک ہوئیں ،اس وقت عوامی ورکرز پارٹی اسلام آباد کی ایک انتہائی سرگرم رکن، اور پارٹی کی مرکزی ڈپٹی سیکریٹری جنرل کے علاوہ پارٹی کے مرکزی ادارے فیڈرل کمیٹی کی ممبر ہیں اور این اے حلقہ 54 اسلام آباد سے الیکشن لڑ رہی ہیں۔

جناب ذوالفقار بروہی، عوامی ورکرز پارٹی لاڑکانہ ضلع کے صدر ہیں اور قومی اسمبلی کے حلقہ این اے 203 قمبر شہداد کوٹ (لاڑکانہ) کے لئے پارٹی کے امیدوار ہیں اور اس حلقے سے الیکشن لڑ رہے ہیں ۔

جناب ضیاء الدین بھٹی آپ ایک پرانے ٹریڈ یونینسٹ اور سیاسی ورکر ہیں، اور اس وقت عوامی ورکرز پارٹی ضلع سکھر کے سرگرم رکن ہیں اسی کے ساتھ ساتھ سندھ نیشنل کمیٹی کے ممبر ہیں این اے حلقہ 207 سکھر سے پارٹی کے امیدوار ہیں۔

صوبائی اسمبلیوں کے حلقوں کے لئے

امیدواران کا تعارف:

رضا خان عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خوا کے ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں ، پی کے 6 سوات سے صوبائی اسمبلی کے امیدوار ہیں۔

تالی مند خان، عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خوا کے ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں، پی کے 21 بنیر سے صوبائی اسمبلی کے امیدوار ہیں۔

عمر زادہ، عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خوا کے ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں، پی کے 23 شانگلہ سے صوبائی اسمبلی کے امیدوار ہیں۔

نصر اللہ خان، عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خوا کے ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں، پی کے 24 شانگلہ سے صوبائی اسمبلی کے امیدوار ہیں۔

حکیم خان، عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خوا کے ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں، پی کے 43 صوابی سے صوبائی اسمبلی کے امیدوار ہیں۔

خالد محمود، عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خوا کے ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں، پی کے 45 صوابی سے صوبائی اسمبلی کے امیدوار ہیں۔

محترمہ ریحانہ شکیل، عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خوا کے ایک انتہائی سرگرم رکن ہیں، آپ نیشنل کمیٹی کے پی کے کی ویمن سیکریٹری ہیں، پی کے 52 مردان سے صوبائی اسمبلی کے لئے پارٹی کی امیدوار ہیں۔

سینگار نو ناری، عوامی ورکرز پارٹی ضلع لاڑکانہ کے انتہائی سرگرم رکن ہیں اسی کے ساتھ ساتھ سندھ نیشنل کمیٹی کے ممبر ہیں پی ایس 17 نصیر آباد ضلع لاڑکانہ سے پارٹی کے صوبائی امیدوار ہیں ۔

حسن عسکری، سانگھڑ ضلع کی ہر دلعزیز سیاسی وسماجی شخصیت ہیں، عمر کے اٹھارویں سال سے بائیں بازو کی سیاست میں حصہ لیتے آرہے ہیں اور اس وقت پارٹی کے مرکزی کسان سیکریٹری کے عہدے پر خدمات انجام دے رہے ہیں، پی ایس 41 سانگھڑ سے پارٹی کی امیدوار ہیں۔

محمد توفیق، آپ ٹریڈ یونینسٹ ہیں اور 1985 سے ملک کی بائیں بازو کی سیاست سے وابستہ ہیں، 2001 میں لیبر کونسلر منتخب ہوئے 2005، اور 2014 میں بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا 2013 کے انتخابات میں لاہور سے عوامی ورکرز پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا لاہور پارٹی کی تمام سرگرمیوں اور ہر پروگرام میں بھرپور شرکت کرتے ہیں. اور پی پی 154 لاہور سے پارٹی کے امیدوار ہیں۔

چوھدری محمد زبیر جو کہ ایک منجھے ہوئے سیاسی رہنما ہیں، جنہوں نے اپنے ضلع کے مزدوروں اور کسانوں کی ہر تحریک میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ اس کو تعمیر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ محمد زبیر معروف کسان رہنما چوھدری فتح محمد کے بھانجے ہیں، پی پی 121 ٹوبہ ٹیک سنگھ سے پارٹی کے امیدوار ہیں۔

عوامی ورکرز پارٹی کی ملک بھر میں جاری سرگرمیوں پر ایک نظر

ترتیب وتدوین: عابد شکیل فاروقی

☆.....عوامی ورکرز پارٹی سندھ قومی کمیٹی کا ایک روزہ اجلاس مورخہ 27 مئی کو حیدر آباد میں منعقد ہوا، اجلاس میں سندھ سے تعلق رکھنے والے فیڈرل کمیٹی کے اراکین نے بھی شرکت کی ، اجلاس کی صدارت سندھ قومی کمیٹی کے صدر نے کی، اجلاس میں تنظیمی امور پر تفصیلی بحث کی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ فیڈرل کمیٹی کی جانب سے جاری کئے گئے کوڈ آف کنڈکٹ کو ضلعی سطح تک جاری کیا جائے گا اور اس پر سختی سے عمل درآمد کرانے کی کوشش کی جائی گی ، ایک تین رکنی الیکشن کمیٹی تشکیل دی گئی، سندھ میں مسنگ پرسن اور پانی کی کمی کے امور پر آواز بلند کرنے کے لئے سندھ میں اپنے اتحادیوں کے ساتھ ملکر حکمت عملی تشکیل دی جائے گی، اور سندھ میں مستقبل کے لئے پارٹی سرگرمیوں پر چند فیصلے کئے گئے۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی ضلع سانگھڑ کا اجلاس مورخہ 2 جون کو سانگھڑ میں ضلعی صدر کامریڈ خلیل بلوچ کی صدارت میں منعقد ہوا، اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ پارٹی کی جانب سے الیکشن 2018 میں پی ایس 41 سانگھڑ سے مرکزی کسان سیکریٹری کامریڈ حسن عسکری الیکشن میں حصہ لیں گے۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی کے صدر جناب فانوس گجر نے مورخہ 8 جون کو ضلع بونیر میں ڈسٹرکٹ ریٹرننگ آفیسر کے دفتر میں قومی اسمبلی کے لئے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کئے، ان کے ہمراہ ضلع بھر کے عہدیدار اور پی آر ایس ایف کے کارکنان کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی۔

☆.....عوامی تحریک کے قائد کامریڈ رسول بخش پلیجو کی آخری رسومات

میں عوامی ورکرز پارٹی کے سینئر نائب صدر کامریڈ یوسف مستی خان، مرکزی سیکریٹری برائے خواتین کامریڈ عالیہ بخشل، سندھ کے صدر کامریڈ بخشل تھلو اور سینئر صوبائی صدر کامریڈ لطیف لغاری نے پارٹی دیگر کارکنان کے ساتھ شرکت کی۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی بادہ یونٹ کے زیر اہتمام مورخہ 10 جون کو ہفت روزہ اسٹڈی سرکل منعقد کیا گیا، نشست میں نوجوانوں کی قابل ذکر تعداد نے شرکت کی۔

☆.....مورخہ 11 جون کو کامریڈ سینگار نوناری نے پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے پی ایس 17 نصیر آباد سے کاغذات نامزدگی جمع کروائے، اس موقع پر پارٹی کے صوبائی نائب صدر کامریڈ اثر امام اور صوبائی سیکریٹری امور محنت کامریڈ روشن کلہوڑو بھی موجود تھے۔

☆.....مورخہ 13 جون کو عوامی ورکرز پارٹی بادہ یونٹ کی جانب سے، سندھ میں پانی کی شدید قلت کے خلاف احتجاجی ریلی نکالی گئی۔

☆.....مورخہ 14 جون کو عوامی ورکرز پارٹی نوڈیرو یونٹ کی جانب سے، سندھ میں پانی کی شدید قلت کے خلاف احتجاجی ریلی نکالی گئی۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی مورو یونٹ کی جانب سے مورخہ 16 جون کو مورو پریس کلب کے سامنے، سندھ میں جبری گمشدگیوں کے خلاف ایک مظاہرے کا انعقاد کیا گیا۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی ضلع لاڑکانہ کے زیر اہتمام ایک عید ملن پارٹی کا انعقاد کیا گیا، جس سے اے ڈبلیو پی کے صوبائی صدر کے علاوہ دیگر عہدیداروں نے خطاب کیا۔

☆.....عوامی ورکرز پارٹی سندھ کے نائب صدر کامریڈ اثر امام، صوبائی لیبر سیکریٹری کامریڈ روشن کلہوڑو، ضلع لاڑکانہ کے انفارمیشن سیکریٹری کامریڈ اسرار نوناری، نے نوڈیرو میں نوڈیرو یونٹ کے یونٹ سیکریٹری کامریڈ زاہد کلر، رتو ڈیرو کے یونٹ سیکریٹری منیر کنبھر، ماہوٹہ یونٹ کے یونٹ سیکریٹری حاتم جتوئی اور لیبر کالونی نوڈیرو یونٹ کے سیکریٹری برکت سموں اور دیگر ساتھیوں سے ملاقات کی اور علاقے میں پارٹی کی تنظیم سازی اور پارٹی سرگرمیوں پر تبادلہ خیال کیا۔

☆.....مورخہ 19 جون عوامی ورکرز پارٹی بادہ یونٹ کے زیر اہتمام، ''بہتر مستقبل کی تلاش'' کے موضوع پر ایک چیریٹیبل اسکول منعقد کیا گیا، بادہ یونٹ کے سیکریٹری برائے نوجوانان کامریڈ سلیم نوناری نے موضوع پر شرکاء سے گفتگو کی، اسکول میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

☆.....مورخہ 23 جون عوامی ورکرز پارٹی کراچی کے زیر اہتمام ایک عید ملن پارٹی کا انعقاد کیا گیا، جس میں پارٹی کے سینئر نائب صدر یوسف مستی خان، سیکریٹری جنرل اختر حسین کے علاوہ کراچی پارٹی کے عہدیدار، اراکین، اور سیاسی ہمدردوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی، عید ملن سے یوسف مستی خان اور اختر حسین نے مختصر خطاب کیا جبکہ شہر کے ممتاز فنکاروں نے ہلکی پھلکی موسیقی سے حاضرین کا دل بہلایا۔

☆.....مورخہ 26 جون کو ممتاز مارکسی دانشور اور ترقی پسند لکھاری کامریڈ پروفیسر یوسف حسن انتقال کر گئے، کامریڈ عوامی ورکرز پارٹی اسلام آباد راولپنڈی کے سیکریٹری برائے تعلیم کے فرائض انجام دے رہے تھے، کامریڈ کے انتقال پر پارٹی کے بانی صدر عابد حسن منٹو، کے علاوہ صدر، سیکریٹری جنرل اور تمام مرکزی و صوبائی عہدیداروں نے اپنے تعزیتی پیغام میں کامریڈ کی رحلت کو پارٹی کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان سے تعبیر کیا۔

☆☆

عوامی ورکرز پارٹی کے تمام ضلعی وصوبائی ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اپنے اپنے علاقوں میں پارٹی سرگرمیوں کے بارے میں مطلع کریں تاکہ ہم اس پرچے کے ذریعہ آپ کی سرگرمیوں سے ملک کے دیگر سیاسی کارکنوں کو باخبر رکھ سکیں۔ اس سلسلے میں پرچے میں درج ہمارے ای میل ایڈریس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

مزید براں گزارش ہے کہ پرچے کے مالی اخراجات کو پورا کرنے میں ہماری مدد کیجیے اور پرچے کے واجبات جلد از جلد ادا کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

(ادارہ)

امیدواران قومی اسمبلی

محترمہ عصمت رضا شاہجہاں (حلقہ این اے 54 اسلام آباد)

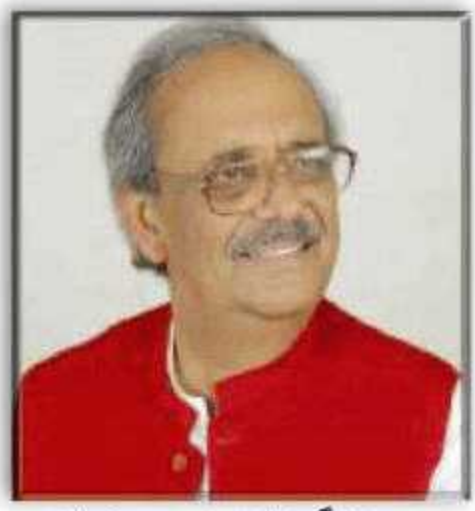

جناب فانوس گجر (حلقہ این اے 9 بنیر کے پی)

خالد محمود زادہ (حلقہ این اے 18 صوابی)

جناب ذوالفقار بروہی (حلقہ این اے 203 قمبر شہداد کوٹ (لاڑکانہ)

جناب عمار رشید (حلقہ این اے 53 اسلام آباد)

جناب ضیاء الدین بھٹی (حلقہ این اے حلقہ 207 سکھر)

جناب شاہد خان (حلقہ این اے 19 صوابی)

جناب بخت نصیب خان (حلقہ این اے 10 شانگلہ)

امیدواران صوبائی اسمبلی

محمد توفیق (حلقہ پی پی 154 لاہور)

چوھدری محمد زبیر (حلقہ پی پی 121 ٹوبہ ٹیک سنگھ)

حسن عسکری (حلقہ پی ایس 41 سانگھڑ)

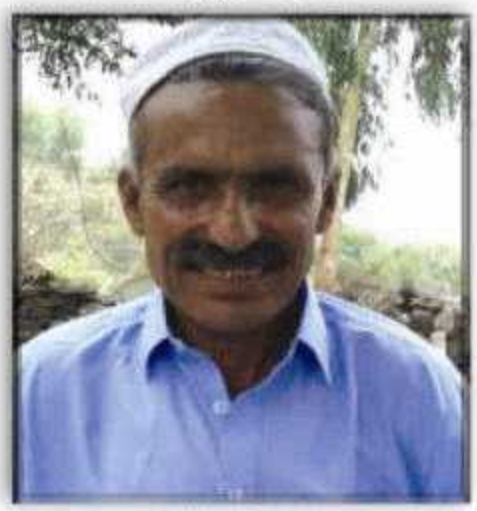

تالی مند خان (حلقہ پی کے 21 بنیر)

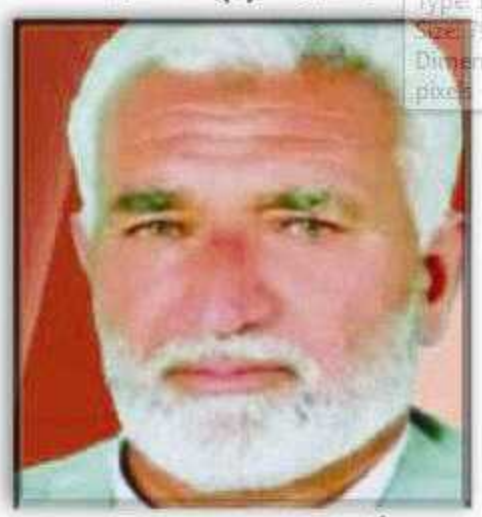

حکیم خان (حلقہ پی کے 43 صوابی)

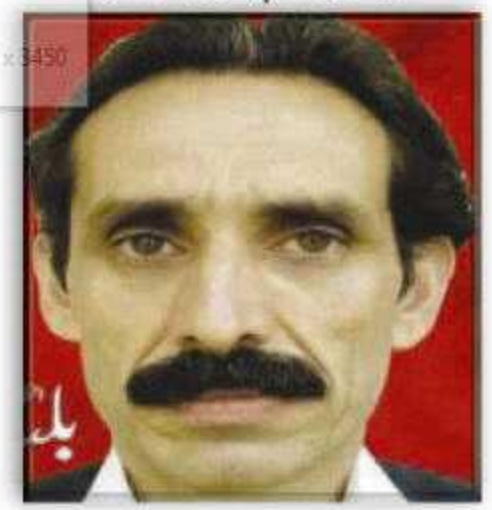

عمر زادہ (حلقہ پی کے 23 شانگلہ)

ملنگ جان (حلقہ پی کے 20 بنیر)

سینگار نو ناری (حلقہ پی ایس 17 نصیر آباد ضلع لاڑکانہ)

رضا خان (حلقہ پی کے 6 سوات)

محترمہ ریحانہ کشیل (حلقہ پی کے 52 مردان)

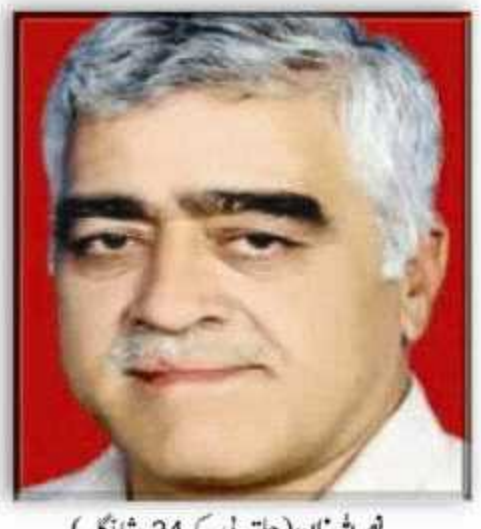

نصر اللہ خان (حلقہ پی کے 24 شانگلہ)

ہم ہیں حقیقی متبادل!

ہمارے منشور کے بنیادی نکات:

- ☆ قبائلی و جاگیرداری باقیات کا خاتمہ اور بنیادی زرعی اصلاحات
- ☆ عورت، مرد اور دیگر صنفوں کی مکمل برابری
- ☆ مذہب کی بنیاد پر ہر طرح کے امتیاز کا خاتمہ
- ☆ غیر جانبدار اور سامراج مخالف خارجہ پالیسی
- ☆ ماحولیاتی نظر سے متوازن اور پائیدار ترقی
- ☆ سیاسی اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی
- ☆ سب کے لیے مفت تعلیم و صحت
- ☆ تمام سیاسی حقوق کا تحفظ
- ☆ حقیقی وفاقیت اور کثیر القومی شناخت
- ☆ روزگار اور رہائش کی ضمانت

عوامی ورکرز پارٹی